بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ط

خواب سے تعبیر تک

آمینہ یونس بلتستانی

عینی ملک پبلی کیشنز

0309-8877027

Khawab Sy Tabeer Tak

By

Amina Younis Baltastani

ISBN # 978-627-7902-08-7

ضابطہ

کتاب	:	خواب سے تعبیر تک
مصنفہ	:	آمینہ یونس بلتستانی
حروف بندی	:	ایم اے سہیل
سرورق	:	ڈاکٹر عارف حسین عارفؔ
تزئین	:	اعظم سہیل ہارونؔ
اہتمام	:	زوہیب پبلشرز حاصل پور
ناشر	:	عینی ملک پبلی کیشنز سیالکوٹ
مطبع	:	حُسنِ ادب فیصل آباد
بارِاوّل	:	جون 2025ء
قیمت	:	800 روپے

انتساب

اس ذات کے نام

جو دلوں کے بھید جانتا ہے

جس کے حضور اشک سجدہ کرتے ہیں

اور جو خاموش دعاؤں کو بھی سُن لیتا ہے

ان والدین کے نام

جنہوں نے اپنی اولاد کے لیے بے لوث قربانیاں دیں

ان قارئین کے نام

جو مجھے محبت سے پڑھتے ہیں

اور غزہ کے ان سپاہیوں کے نام

جنہوں نے ظلم کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا

فہرست

❖❖❖❖❖

''خواب سے تعبیر تک'' اور آمِنہ یونس بلتستانی

''خواب سے تعبیر تک'' صرف کہانیوں کا مجموعہ نہیں، بلکہ احساسات، رشتوں اور معاشرتی سچائیوں کا ایک آئینہ ہے۔ آمینہ یونس بلتستانی نے ان نثری افسانچوں کے ذریعے نہ صرف ادب میں ایک خوب صورت اضافہ کیا ہے بلکہ امن، محبت، درد اور روحانیت کے کئی پہلوؤں کو بھی اُجاگر کیا ہے۔

اِن کی تحریروں میں ''بیوی'' کے رشتے کی نفسیاتی گہرائیاں ہیں، تو کہیں ''ممتا'' جیسی پاکیزہ محبت کا عکس۔ بعض کہانیوں میں ''احساسِ کمتری'' جیسے حساس موضوع کو بھی بڑی مہارت سے بیان کیا گیا ہے، جو قاری کو نہ صرف جھنجھوڑتا ہے بلکہ سوچنے پر بھی مجبور کرتا ہے۔

''تقدیر کا کھیل'' جیسے عناصر کرداروں کی بے بسی کو عیاں کرتے ہیں اور ''انسان اور جنات'' کی کہانیوں میں حقیقت اور ماورائی دنیا کی دلچسپ آمیزش قاری کو ایک نئی فکری دنیا میں لے جاتی ہے۔

آمینہ یونس بلتستانی کا قلم نرم بھی ہے اور بے رحم بھی یہ جہاں محبت بانٹتا ہے، وہیں سچائی کا آئینہ بھی دکھاتا ہے۔ اِن کا اندازِ تحریر سادہ مگر دل میں اُتر جانے والا ہے۔

''خواب سے تعبیر تک'' ہر اِس قاری کے لیے ایک تحفہ ہے جو ادب میں نہ صرف کہانی ڈھونڈتا ہے بلکہ اس میں زندگی، جذبات اور پیغام بھی تلاش کرتا ہے۔

اعظم سہیل ہارون (گولڈ میڈلسٹ)
زوہیب پبلشرز حاصل پور

آمِنہ یونس بلتستانی اور ’’خواب سے تعبیر تک‘‘

نثر ادب کی وہ صنف ہے جس میں خیالات اور جذبات کو سادہ، رواں اور بے ساختہ انداز میں بیان کیا جاتا ہے، بغیر کسی وزن یا قافیہ کی پابندی کے۔ یہ دل سے نکلی بات کو براہِ راست قاری کے دل تک پہنچاتی ہے۔ اردو نثر کو وسعت، فکری گہرائی اور ادبی حسن دینے والوں میں سرسید احمد خان، مولانا ابوالکلام آزاد اور قراۃ العین حیدر جیسے عظیم نام شامل ہیں، جنہوں نے نثر کو ایک فن اور ایک فکری تحریک میں ڈھال دیا اور اب اسی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے آمینہ یونس بلتستانی بھی اپنی پہلی کتاب کی صورت میں شمع جلانے والی ہیں۔

جیسا کہ آپ کے نام سے ظاہر ہے، آپ کا تعلق بلتستان جیسے حسین وادیوں، پہاڑوں، جھرنوں اور پتھریلے راستوں والے خطے سے ہے۔ آپ کی تحریریں اسی سرزمین کے حسن اور سادگی کی عکاس ہیں۔

مجھے قوی امید ہے آپ ’’خواب سے تعبیر تک‘‘ کے ادبی سفر میں افسانچوں اور کہانیوں کے ذریعے ادبی دنیا میں جلد ہی ایک منفرد مقام حاصل کر لے گی۔ آپ کی نثری تخلیقات محبت، امن اور روحانی پیغام کی حامل ہیں، جن میں مذہب کا ایک نمایاں رنگ محسوس کیا جا سکتا ہے۔

’’خاموشی‘‘، ’’خدا اور خوف‘‘ جیسی تحریر آخرت کی یاد دہانی کرواتی ہے، تو ’’پھٹی چپل‘‘ جیسے بظاہر سادہ موضوع پر کہانی پیچیدہ سماجی پرتیں کھولتی ہے۔ ہر تحریر قاری کو ایک سوال دے جاتی ہے، یا پھر ایسا سبق جو دیر تک ذہن میں رہتا ہے۔

’’لبیک اے ارضِ وطن‘‘ وطن سے محبت کا ایسا اظہار ہے جو دل کو چھو جاتا ہے۔ فلسطین سے

اظہارِ ہمدردی اور مظلوموں سے محبت آپ کی تحریروں میں نمایاں نظر آتی ہے۔

بلاشبہ، آمینہ یونس بلتستانی نے اپنے زورِ قلم سے اردو ادب کو گراں قدر تحفے دیا ہے۔ان کی ہر تحریر ایک نیا زاویہ، ایک نئی سوچ اور ایک نئی بصیرت لے کر آتی ہے۔

عینی ملک

پی ایچ ڈی انگلش سکالر

ناول نگار

پیش لفظ

کبھی یہ محض ایک خواب تھا۔لفظوں سے باتیں کرنا،احساسات کے جملوں میں ڈھالنا اور جذبات کو افسانہ بنا دینا۔دل چاہتا تھا کہ قلم تھاموں اور ہر وہ بات لکھوں جو دل میں کہرام مچانے بیٹھی ہے مگر ہر بار کوئی نہ کوئی رکاوٹ،کوئی اندرونی خوف یا خود پر بے یقینی راستہ روک لیتی۔

پھر وقت گزرتا گیا۔۔۔خواب کہیں دل کے ایک کونے میں دبک گیا۔میں نے بھی ہار مان لی کہ شاہد لکھنا میرے مقدر میں نہیں۔لیکن کچھ خواب ایسے ہوتے ہیں جو خاموش نہیں رہتے۔ وہ اندر ہی اندر سانس لیتے ہیں، پنپتے ہیں اور کچھ حادثات ایسے آتے ہیں جن کے بدلے میں اللہ تعالیٰ لفظوں کی بدولت عطا کرتا ہے ایک دن یوں خود بخود الفاظ افسانوں کی شکل میں بہنے لگتے ہیں جیسے صدیوں پرانا دریا پھر سے رواں ہو جائے۔

یہ افسانے میرے دل کی دھڑکنیں ہیں۔ یہ کہانیاں میرے اور آپ جیسے لوگوں کی کہانیاں ہیں،کبھی مکمل،کبھی ادھوری،کبھی خواب اور کبھی تعبیر۔

یہ کتاب ''خواب سے تعبیر تک'' نہ صرف میرے قلم کی واپسی ہے بلکہ اس یقین کا اعلان ہے کہ اگر خواب سچے ہوں،تو تعبیر خود چل کر آتی ہے۔

آمینہ یونس بلتستانی

بسکٹ

دوپہر کی نرم دھوپ کمرے میں چھن چھن کر آ رہی تھی۔ صوفیہ کتاب پڑھنے میں مصروف تھیں کہ اچانک حسان روتا ہوا دوڑتا آیا۔

''امی، امی! میں نے بسکٹ کھانے ہیں۔'' چھوٹے چھوٹے ہاتھ آنسوؤں سے بھیگے ہوئے چہرے کے ساتھ بسکٹ مانگ رہے تھے۔

صوفیہ نے کتاب ایک طرف رکھی اور شفقت سے اسے گود میں اٹھا لیا۔ ''بیٹا! آپ کو پتہ ہے بسکٹ میں کیا ہوتا ہے؟ اس میں نہ تو کوئی غذائیت ہوتی ہے، نہ ہی یہ بھوک مٹاتا ہے۔ بسکٹ سے صرف وقتی خوشی ملتی ہے، لیکن جسم کو فائدہ نہیں ہوتا۔''

وہ نرمی سے اس کے بال سہلاتے ہوئے بولیں۔ ''آؤ، میں تمہیں دودھ بنا کر دوں یا مزیدار سا دلیا۔ یہ چیزیں تمہیں طاقت بھی دیں گی۔''

حسان نے اپنی بڑی بڑی معصوم آنکھوں سے پوچھا۔ ''امی! اس سے کیا ہوگا؟''

صوفیہ مسکرا دیں۔ ''بہت اچھا سوال کیا، میرے بیٹا! دودھ، دلیا اور پھل فروٹ جیسی غذائیں جسم کو مضبوط بناتی ہیں اور دماغ کو تیز، جب جسم اور دماغ مضبوط ہوں تو انسان ہر چیلنج کا بہتر مقابلہ کر سکتا ہے۔''

حسان کے چہرے پر دلچسپی جھلکنے لگی۔ ''تو کیا میں سامعیہ سے، اپنے دوستوں سے، کلاس میں سب سے جیت جاؤں گا؟''

صوفیہ نے ہنستے ہوئے اسے قریب کیا اور نرمی سے کہا۔ ''بیٹا! جیتنے کا مطلب لڑائی یا جھگڑا نہیں ہوتا۔ اصل جیت محبت، سمجھداری اور علم سے حاصل ہوتی ہے۔''

''لیکن امی، آپ نے تو کہا تھا کہ جسم مضبوط ہو تو جیت جاتا ہے؟'' حسان نے معصومیت سے پوچھا۔ صوفیہ نے صبر سے سمجھایا۔

''جی ہاں میری جان! اچھی غذا کھانے سے جسمانی قوت اور دماغی صلاحیت بڑھتی ہے جس سے انسان بیماریوں سے محفوظ رہتا ہے، پڑھائی میں آگے بڑھتا ہے اور زندگی کے مقابلوں میں ہار نہیں مانتا۔''

حسان نے چمکتی آنکھوں سے پوچھا؟''اگر میں بسکٹ اور پاپڑ چھوڑ دوں تو کیا میں طاقتور اور قابل انسان بن جاؤں گا؟''

صوفیہ نے خوشی سے اس کی پیشانی چومتے ہوئے جواب دیا۔''ہاں میرے بیٹے! اگر آپ بچپن سے اچھی اور توانائی بھری غذائیں کھائیں گے تو ان شاء اللہ آپ جسمانی طور پر مضبوط اور دماغی طور پر ذہین انسان بنیں گے اور پھر آپ اپنے دوستوں کو بھی یہ اچھی بات سکھا سکیں گے۔''

حسان نے پُرعزم انداز میں کہا۔''ان شاء اللہ، امی جان۔''

اسی شام حسان اپنے دوستوں کے درمیان کھڑا ہو کر بڑی سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔''دیکھو دوستو! بسکٹ اور پاپڑ کھانے سے صرف زبان خوش ہوتی ہے۔ لیکن دودھ، دہی اور پھل ہمیں بہادر اور ہوشیار بناتے ہیں۔ آئندہ ہم سب اچھی چیزیں کھائیں گے تاکہ بڑے ہو کر سب سے اچھے انسان بنیں۔''

صوفیہ نے دُور سے یہ منظر دیکھا تو مسکرا کر دل ہی دل میں رب کا شکر ادا کیا۔ چھوٹے بیج محبت اور حکمت سے بو دیئے جائیں تو وہ ایک دن گھنے درخت بن کر دنیا کو سایہ دیتے ہیں۔

❖❖❖❖❖

پھٹی ہوئی چپل

گھر میں افراد تو کل پانچ ہی تھے مگر امی کی زبان پر ہمیشہ کام کی دہائی رہتی تھی۔ یوں لگتا جیسے گھر میں دس بارہ افراد رہتے ہوں۔ صائمہ جب اس بات کا ذکر کرتی تو امی کہتیں، ''بیٹی مانا کہ گھر میں چھوٹا بچہ صرف حریم ہے، مگر بڑوں کے بھی کپڑے وقت پر دھل کر ملنے چاہئیں۔ کھانا بھی وقت پر پکے، یہ سب ضروری ہے۔''

صائمہ نے ہلکے سے تکرار کی، جس سے گھبرا کر چھوٹی بہن ارم اسے کمرے میں لے گئی۔ کہنے لگی، ''آپی بس کریں، امی کی تو عادت ہے، آپ بھی ان کے ساتھ الجھنے لگتی ہیں۔''

صائمہ بولی، ''میں صرف سمجھا رہی تھی۔''

ارم نے کہا، ''اس بات کو یہیں ختم کریں، کوئی اچھی سی کتاب پڑھیں یا کچھ اور کریں۔''

صائمہ نے جواب دیا، ''تم پڑھ لو، میں باہر جا رہی ہوں۔ یہاں کچھ ٹھنڈ لگ رہی ہے، شاید باہر کی دھوپ میں طبیعت ہلکی ہو جائے۔''

ارم نے کہا، ''ٹھیک ہے، میں تھوڑی تلاوت کرتی ہوں، صبح وقت نہیں ملا تھا۔''

صائمہ نے سراہا، ''اچھی بات ہے، تم تلاوت کرو، میں ذرا باہر ہو آتی ہوں۔''

صائمہ نے گھر سے نکلتے وقت جو چپل سامنے نظر آئی وہی پہن لی۔ باہر نکلی تو دھوپ نے اس کا استقبال کیا۔ بدن میں ایک سکون سا اتر گیا۔ گھر ایسی جگہ پر تھا جہاں سبز کھیت تھے، بہتا پانی اور دُور پہاڑوں پر برف چمکتی دکھائی دیتی۔ وہ ان مناظر سے لطف اندوز ہوتے ہوئے چلتی جا رہی تھی کہ بار بار چپل پاؤں سے نکلنے لگی۔

اس نے رک کر چپل کو دیکھا۔ وہ پرانی اور پھٹی ہوئی تھی۔ جلدی میں وہ غلطی سے پرانی چپل پہن آئی تھی۔ صائمہ نے خود سے کہا، ''اب سمجھ آیا کہ پاؤں میں چپل کیوں تکلیف دے رہی تھی۔'' یہ سوچ کر اس کے ذہن میں کئی خیال آ گئے۔ اس نے خود سے سوال کیا، ''جب ایک

پھٹی چپل ہمیں آرام سے چلنے نہیں دیتی، دوڑنے نہیں دیتی، منزل تک پہنچنے میں رکاوٹ بنتی ہے، تو وہ اعمال جو ہم روز کرتے ہیں اور جن میں غفلت برتتے ہیں، کیا وہ اللہ تک ہماری رسائی میں رکاوٹ نہیں بنیں گے؟ تو کیا ہماری دُعائیں سیدھی اللہ تک پہنچ سکیں گی؟ کیا ہمیں جنت کے قابل بننے کے لیے اپنی ذات میں اصلاح نہیں لانی چاہیے؟ جس طرح پھٹی چپل راستہ روک لیتی ہے، ویسے ہی گناہ اللہ کی رضا تک پہنچنے میں رکاوٹ بن سکتے ہیں۔''

گھر آکر اس نے دیکھا کہ امی اور بہن سبزی صاف کر رہی تھیں۔ وہ خاموشی سے ان کے ساتھ بیٹھ گئی اور سبزی کے ساتھ گھاس الگ کرنے لگی۔ امی نے صائمہ کی خاموشی محسوس کی۔ پوچھا،''بیٹی کیا ہوا؟ کچھ چپ چپ ہو؟''

صائمہ بولی،''امی میں کچھ سوچ رہی ہوں۔''

امی نے پوچھا،''کیا سوچ رہی ہو؟''

صائمہ نے دھیرے سے کہا،''امی آج میں باہر چہل قدمی کو نکلی اور بے خیالی میں پھٹی ہوئی چپل پہن لی۔ وہ بار بار پاؤں سے نکل رہی تھی اور مجھے بار بار جھک کر دیکھنا پڑتا تھا۔ تب میں نے سوچا، یہ چپل میرے راستے کی رکاوٹ بن گئی ہے۔ ہم خود بھی تو ایسے ہیں، کئی گناہ ہماری ذات سے چمٹے ہوتے ہیں، ہم اصلاح نہیں کرتے۔ پھر اللہ کی راہ پر کیسے چلیں گے؟''

امی نے مسکرا کر کہا،''تم نے بالکل ٹھیک سوچا۔ جب نیت پاک اور عمل درست ہو تو راستے بھی ہموار ہو جاتے ہیں۔ ورنہ انسان تھک جاتا ہے، ٹھوکر کھاتا ہے اور منزل کھوٹی ہو جاتی ہے۔''

❖❖❖❖❖

خاموشی

مہرالنساء کچن سے برتن دھونے کے بعد دوپہر کی چائے لے کر لاؤنج میں آئی تو دیکھا،ضمیر حسین صوفے پر چپ چاپ بیٹھے کھڑکی کے پار خلا میں کچھ تک رہے تھے۔

''آج کل آپ کچھ زیادہ ہی خاموش نہیں ہوگئے؟'' وہ کپ میز پر رکھتے، ہوئے بولی۔

ضمیر نے چونک کر بیوی کی طرف دیکھا، جیسے خیالوں کی گہرائی سے کوئی آواز کھینچ لائی ہو،

''نہیں تو تمہیں ایسا لگتا ہے؟ زیادہ تو میں پہلے بھی نہیں بولتا تھا۔'' مہرالنساء تھوڑا قریب ہو کر صوفے پر بیٹھ گئی لیکن یوں چپ چپ بھی نہیں رہتے تھے۔

''کچھ تو ہے جو آپ مجھ سے چھپانا چاہتے ہیں۔ٹھیک ہے، نہ بتائیں!'' وہ خفا ہو کر اٹھنے لگی تو ضمیر نے نرمی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''مہرو، ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے جو تمہیں نہ بتا سکوں۔'' مہرالنساء کی آنکھوں میں الجھن تھی۔

''تو پھر ایسی خاموشی کی وجہ؟ ہر وقت کی یہ سوچ بے وجہ تو نہیں ہوسکتی۔''

ضمیر نے ایک گہری سانس لی، پھر نظریں چھت پر جم گئیں جیسے الفاظ ڈھونڈ رہا ہو۔''تمہیں کیا بتاؤں، مہرو؟''

''وہی جو آپ سوچ رہے ہیں، جس کی وجہ سے میں اور بچے نظر انداز ہو رہے ہیں۔'' مہرو کا لہجہ اس بار شکوہ لیے ہوئے تھا۔

ضمیر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا جیسے پہلی بار یہ بات سن رہا ہو۔

''کیا میں واقعی اپنی سوچ میں اتنا گم ہوگیا ہوں کہ اپنے گھر والوں کو نظر انداز کرنے لگا ہوں؟''

مہرو نے زور دے کر کہا۔''اب زیادہ باتیں نہ بنائیں بس وہ بتائیں جس کی وجہ سے مابدولت کی حق تلفی ہو رہی ہے۔''

وہ شوخی سے بولی۔ ''لیکن دل میں ایک انجانے خدشے نے جگہ بنا لی تھی۔عورت ذات تھی، دل میں ایک کونا ہمیشہ خالی رہتا ہے۔ جہاں شک پلتا ہے۔''

ضمیر نے ہنستے ہوئے کہا، ''ٹھیک ہے، غصہ تھوک دو، اب بتاتا ہوں۔''

پھر کچھ لمحے سنجیدگی کی دبیز چادر تنی رہی۔

''جب سے بچے اسکول جانے لگے ہیں، مجھے اپنی آخرت کی فکر ستانے لگی ہے مہرو۔'' وہ کھڑکی کے پار آسمان کو تکتا رہا۔

''آخرت؟'' مہرالنساء نے حیرانی سے پوچھا۔

''ہاں۔ دن رات یہی سوچتا ہوں کہ ہم دین سے کتنے قریب ہیں اور آخرت کی تیاری کی کتنی فکر کرتے ہیں۔لیکن جتنا سوچتا ہوں اتنا ہی خود کو دین سے دُور پاتا ہوں۔اس کا بچوں کے اسکول سے کیا تعلق؟''

ضمیر اب سیدھا ہو کر بیٹھ گیا جیسے کوئی بوجھ اتارنے کا وقت آ گیا ہو۔ ''ہم بچوں کی دنیاوی تعلیم پر ہزاروں روپے خرچ کرتے ہیں۔کل ہی پریپ اور نرسری میں پڑھنے والے ہمارے دو بچوں کی فیس دی، صرف ایک مہینے کی دس ہزار روپے اور مدرسے کی فیس؟ صرف دو سو روپے، وہ بھی مشکل سے۔ جب کمیٹی والے آتے ہیں تو ہم بہانے بنانے لگتے ہیں۔''

مہرالنساء نے نظریں جھکا لیں، جیسے اس آئینے میں اپنا عکس دیکھ لیا ہو۔ضمیر کی آواز اب بھاری ہو چکی تھی۔

''ہم دنیاوی تعلیم پر لاکھوں خرچ کرنے کو تیار ہیں، لیکن دین کی تعلیم پر ہزار بھی دینے میں تنگی محسوس کرتے ہیں۔ ہم بچوں کو خود دین سے دُور کر رہے ہیں۔ دنیا کو ان کے سامنے اتنا رنگین بنا دیا ہے کہ دین پیچھے رہ گیا۔ ہم خود کہتے ہیں، بیٹا! اے پلس نمبر لانے ہیں۔ ذیشان سے آگے نکلنا ہے۔لیکن، کبھی یہ نہیں کہتے، بیٹا! اللہ سے محبت کرو، نماز کو اپنا زیور بناؤ۔''

اب مہرالنساء کی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔

''آپ نے بالکل درست کہا، ضمیر! ہم نے خود بچوں کو صرف دنیا کے پیچھے لگا دیا ہے۔ دین

کا رنگ تو جیسے ماند ہو گیا ہے۔''

کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ کھڑکی سے آتی دھوپ، دونوں کے دل کی گرہ کھول رہی تھی۔

❖❖❖❖❖

تم گواہ رہنا

خالد کا دم گھٹ رہا تھا۔ دل جل رہا تھا۔ جسم میں خون کی جگہ غم گردش کر رہا تھا۔ لیکن ان سب کا عکس آنکھوں تک نہیں آیا کیونکہ وہ ایک مجاہد تھا۔ اس نے اور ہر فلسطینی نے اپنے آپ کو جہاد کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ جو خود کو اللہ کی راہ میں نذر کرتا ہے، ان کا دل رو بھی رہا ہو تو چہرے پر ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ یہی تو اللہ والوں کی نشانی ہے۔ یہی وہ لوگ ہوتے ہیں جو دین پر اپنا سب کچھ قربان کر دیتے ہیں اور اُف تک نہیں کرتے۔ اللہ کی رضا میں راضی ہونا ہی کامل ایمان کی علامت ہے اور یہ اللہ نے اہلِ فلسطین کے نصیب میں لکھ دیا ہے۔

غزہ کے جنوب میں ایک گھر کا آنگن جیسے بہاروں سے بھر گیا ہو۔ رات کا وقت تھا۔ چاند کی مدھم کرنیں ہر طرف بکھری ہوئی تھیں اور ستارے قطار در قطار آسمان کی وسعت میں محوِ سفر تھے۔ خالد کی بیوی صالحہ نے آسمان کو دیکھتے ہوئے دل میں دُعا کی: ''یا اللہ! ہماری اس خوشی کو چار چاند لگا دے، خالد بھی آ جائے تو تیرا شکر ادا کروں۔''

وہ لان سے پلٹ کر گھر کی طرف متوجہ ہوئی ہی تھی کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔ صالحہ نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ بچے بھی اندر سے بھاگ کر باہر آ گئے۔ ''مما! بابا آ گئے؟'' صالحہ نے دروازہ کھولا تو سامنے خالد کھڑا تھا، دھول مٹی میں اَٹا ہوا۔ صالحہ نے راستہ دیا، خالد اندر آ گئے۔ صالحہ اور بچے اِن سے لپٹ گئے۔ کسی کو ان کے لباس یا حالت کی پرواہ نہیں تھی، بس صرف اس بات کی خوشی تھی کہ خالد واپس آ گئے ہیں۔

سب خوشی خوشی اندر بڑھ گئے۔ چھوٹا بیٹا حسان بہت خوش تھا کیونکہ آج اس کی سالگرہ تھی۔ گھر جگمگا رہا تھا۔ سب کی خوشی کو دیکھ کر خالد بھی خوش ہو گیا اور اللہ کا شکر ادا کرنے لگا کہ اس نے دوبارہ اپنے خاندان کو دیکھنے کی زندگی دی۔ صالحہ نے کہا: ''آپ نہا لیں، کپڑے بدل لیں، میں بچوں اور مہمانوں کو دیکھتی ہوں۔'' سارے قریبی رشتہ دار مدعو تھے۔ صالحہ ایک پڑھی لکھی،

باہمت اور زمانہ شناس خاتون تھی۔غزہ کی افسردہ فضا میں خوشی بکھیرنے کی خاطر آج کی یہ محفل سجا رکھی تھی۔

خالد بھی شریک ہوا۔سب نے ''ہیپی برتھ ڈے'' کے شور میں حسان سے کیک کٹوایا۔ خوبصورت تحفے دیئے گئے، دُعاؤں کے تحفے بانٹے گئے۔ رات گئے سب مہمان رخصت ہوئے تو صالحہ بچوں کو سُلا کر کمرے میں آئی، جہاں خالد اس کا انتظار کر رہا تھا۔

''کیا صورت حال ہے محاذ کی؟'' صالحہ نے دھیرے سے پوچھا۔

''اچھی خبر نہیں ہے،'' خالد نے افسردگی سے کہا،''اب دشمن ہمارے مورچوں سے نکل کر آبادیوں کو نشانہ بنانے لگا ہے۔اللہ خیر کرے۔''

''اگر دشمن یہاں تک آ گیا تو؟''

''تو ہم شہداء میں شامل ہو جائیں گے۔''

یہ سن کر صالحہ کی آنکھیں نم ہو گئیں۔گلوگیر آواز میں بولی:''کیا کوئی ہمارے مدد کو نہیں آئے گا؟''

''کون آئے گا؟'' خالد بولا۔''اب امت مسلمہ متحد نہیں رہی۔ سب صرف اپنا دفاع کرتے ہیں۔کوئی بڑے ممالک کو اپنا دشمن نہیں بناتا اور ایمان بھی اب ویسا نہیں رہا۔ہمیں اپنی جنگ خود لڑنی ہے۔''

پھر وہ مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔''ان سب باتوں کو چھوڑو۔چند لمحے ملے ہیں، اپنی بات کرتے ہیں۔بچوں کی پڑھائی کیسی جا رہی ہے؟اور تم کیسی ہو؟''

صالحہ ہنس دی۔''پڑھائی اچھی ہے اور میں آپ کے سامنے ہوں، تبھی تو رات بھی روشن لگ رہی ہے۔''

صبح ناشتے کے بعد خالد نے کہا:''مجھے آج ہی واپس جانا ہے۔حالات بہت خراب ہیں، زیادہ دیر یہاں نہیں رہ سکتا۔''

یہ سن کر صالحہ اور بچے خاموش ہو گئے۔خالد نے سب کو گلے لگایا، بولا:''اللہ کے حوالے۔

بچوں! اپنی مما کو تنگ مت کرنا۔"

بڑا بیٹا مہد بولا، "بابا! میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گا۔ دشمن سے لڑوں گا۔"

"جی بیٹا، کیوں نہیں! جب بڑے ہو جاؤ گے تو ضرور۔ ویسے بھی اب جنگ صرف بڑوں نے نہیں، بچوں نے بھی لڑنی ہے اور شہادت پر فائز ہونا ہے۔"

خالد بیوی بچوں کو اللہ کے حوالے کر کے روانہ ہو گیا۔ کچھ دن بعد جنگ محاذ سے نکل کر غزہ کی گلیوں تک پہنچ گئی۔ گھروں اور انسانوں کے نشان تک مٹا دیئے گئے۔ آسمان بھی آنسو بہانے لگا۔ چند دن پہلے جو گھر ستاروں کی طرح جگمگا رہا تھا، اب شہداء کے لہو سے لال ہو چکا تھا۔ وہ خوبصورت گھر اب کھنڈر بن چکا تھا۔

صالحہ اور اس کے بچے جنت کی طرف چلے گئے تھے۔ جب یہ خبر خالد تک پہنچی تو اس کی آنکھیں خشک تھیں، لیکن اس کا رواں رواں رو رہا تھا۔ اس نے اہلِ فلسطین کی مٹی سے مخاطب ہو کر کہا:

"اے سرزمینِ انبیاء! گواہ رہنا، ہم نہ پیچھے ہٹے، نہ ہم نے پیٹھ دکھائی۔ گواہ رہنا، بروزِ قیامت ہم نے اس مقدس سرزمین کے لیے اپنی جان، مال، بیوی، بچے سب قربان کر دیئے تاکہ اسلام زندہ رہے۔۔۔"

❖❖❖❖❖

دھواں سے روشنی تک

مریم کی پیشانی پسینے سے تر ہو چکی تھی۔ وہ کب سے انگھیٹی میں لکڑی ڈال کر پھونک مار رہی تھی لیکن لگتا تھا۔۔۔لکڑی نے بھی مریم کو زچ کرنے کا سوچ رکھا ہے۔ جلنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ مریم کی ماں، زیتون خاتون، فجر کی نماز پڑھ کر ذکر و اذکار میں مصروف تھیں اور اس انتظار میں تھی کہ کب مریم چائے کا ایک کپ دے گی۔ روزانہ ناشتہ زیتون خاتون خود بناتی تھیں لیکن آج انہوں نے مریم سے کہا۔

''میں تھوڑی دیر اپنے رب سے راز و نیاز کرنا چاہتی ہوں۔ اس لیے صبح کا ناشتہ تم بنانا اور ذرا جلدی بنانا، کیونکہ تمہارے ابو نے مسجد سے آ کر ناشتہ کر کے کام پر نکلنا ہے۔'' لیکن مریم ناشتہ تو دُور کی بات، ابھی تک آگ بھی نہیں جلا پائی تھی، اوپر سے امی آواز پہ آواز دیئے جا رہی تھیں۔

''بیٹی! گلا خشک ہو گیا ہے اب تو ایک کپ چائے پلا دو۔''

''امی، لاتی ہوں تھوڑا صبر تو کریں۔'' مریم بڑبڑانے لگی، امی کو چائے کی پڑی ہے ادھر میری پھونک مار مار کر سانس پھول گئی ہے۔ غصے میں آ کر مریم نے ماچس کی کئی تیلیوں کو ایک ساتھ رگڑا اور جلتی ہوئی تیلیاں انگھیٹی میں پھینک دیں۔ ''اب دیکھتی ہوں کیسے نہیں جلے گی۔'' اس نے لکڑی کو بھی مخاطب کر لیا۔ آخر کار لکڑی نے آگ پکڑ لی اور مریم نے سکون کا سانس لیا، جیسے کوئی مشکل معرکہ سر کر لیا ہو۔ ابھی وہ پُرسکون ہوئی ہی تھی کہ ماں کی پھر سے آواز آئی۔

''مریم، اے مریم، ناشتہ تیار ہو گیا؟''

یہ سن کر مریم کے تن بدن میں جیسے آگ لگ گئی۔ دل میں سوچا، ہاں! ہاں! یہاں سوئی گیس جل رہی ہے نہ؟ انگھیٹی میں لکڑی ڈالو، اس پر پھونک مار کر جلا بھی لو، جلدی سے چائے بھی تیار کر و اور ناشتہ بھی، خود امی یہ سب کیسے اور جلدی جلدی کرتی ہیں پتہ نہیں چلتا! میرے لیے تو یہ

کے۔ٹو سر کرنے کے مترادف ہے۔

اپنے خیال پر خود ہی ہنس لی، پھر چائے بنا کر امی کو دی۔ چولہے پر توا رکھا اور روٹی بنانے لگی۔ساتھ ہی ساتھ دل میں خواب بھی بُننے لگی، میں بہت پڑھوں گی، ایک اچھی نوکری تلاش کروں گی، پھر اس لکڑی کی انگھیٹی سے جان چھڑوالوں گی، تاکہ پھونک مار مار کر دھواں سے آنکھیں لال ہونے سے بچ سکیں۔

ناشتہ تیار ہو چکا تھا۔ابو بھی آگئے تھے۔امی بھی اذکار ختم کر کے آچکی تھیں اور چھوٹے ہادی اور ملیحہ کو جگا رہی تھیں۔سب دستر خوان پر آکر بیٹھ گئے تو ابو نے مریم کو دیکھ کر کہا۔

’’لگتا ہے آج ناشتہ مریم نے بنایا ہے‘‘

امی چپکے چپکے مسکرا رہی تھیں۔مریم نے حیرانی سے پوچھا،’’ابو، آپ کو کیسے پتا چلا؟‘‘ابو نے ہنستے ہوئے کہا،’’تمہاری شکل سے! وہاں انگھیٹی میں پھونک مارنے کے نشان ہیں۔‘‘ابو کی بات سن کر سب ہنس پڑے اور مریم نے شرارت سے کہا،’’جی ابو، میں نے ہی بنایا ہے، کئی گھنٹے لگا کر چلو، اچھا بنایا ہے، ناشتہ مزیدار ہے۔‘‘ابو نے تعریف کی تو مریم کو خوشی ہوئی۔

ناشتے کے بعد بچے سکول جانے کی تیاری میں لگ گئے۔زیتون خاتون نے تھرموس میں چائے ڈالی اور ایک رومال میں روٹی باندھی کیونکہ جاوید، یعنی مریم کے والد، کام پر جانے والے تھے۔وہ مزدور پیشہ آدمی تھے۔لیکن بچوں کی تعلیم کو اپنا سب سے بڑا خواب بنا رکھا تھا۔

سب کے جانے کے بعد زیتون خاتون گھر کے کاموں میں لگ گئیں۔مرغیوں کو دانہ ڈالا، گائے کا دودھ دویا، بھیڑ بکریوں کو چارہ دیا۔ان سب کاموں سے فارغ ہو کر جب دوپہر کے کھانے کی تیاری کرنے لگیں، تو چولہا جلاتے ہوئے ان کے لبوں پر محبت بھری مسکراہٹ آ گئی۔

مریم پڑھ رہی تھی اور وہ باقی بچوں سے بہتر تھی۔اسی وجہ سے ماں اسے کام پر کم لگاتی تھی، لیکن جب بھی وہ، کچن میں آتی، اس کا پارہ ہائی ہونے لگتا تھا! مسئلہ وہی۔لکڑی اور مریم کی لڑائی! جب بھی مریم چولہے کے قریب آتی اسی دن لکڑی بھی ضد پر اتر آتی تھی۔

یوں ہنستے روتے، محنت کرتے، مریم نے آخرکار انگھیٹی سے چھٹکارا پانے کے لیے انتھک محنت کی۔اس نے ماسٹرز کی، ڈگری حاصل کی اور جاوید صاحب نے اپنے باقی بچوں کو بھی زیورِ تعلیم سے آراستہ کیا۔وہ کہتے تھے،''ہم غریب تھے، ہمارے والدین کو شعور نہیں تھا، اس لیے ہم اَن پڑھ رہ گئے، لیکن اگر مجھے دن رات محنت بھی کرنی پڑے تو میں اپنے بچوں کو تعلیم دلواؤں گا اور انہیں معاشرے میں ایک اچھا مقام دلواؤں گا۔''

یہ ان کا عزم ہی تھا جس نے بچوں کو تعلیم و تربیت سے بہرہ مند کیا۔ جاوید صاحب اور زیتون خاتون اللہ کا شکر ادا کرتے کہ ان کے خواب حقیقت بن گئے اور انہوں نے اپنے بچوں کے سامنے سرخرو ہو کر دکھایا۔

ادھر مریم نے مقابلے کا امتحان دیا تھا۔ایک دن سب بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک مریم کے موبائل کی گھنٹی بجی۔اسکرین جگمگا رہا تھا۔مریم نے آہستہ سے''ہیلو'' کہا تو دوسری طرف سے آواز آئی Unknown Number

''یہ آپ مریم جاوید ہیں؟ مبارک ہو، میں کالج سے بات کر رہا ہوں، آپ کو سلیکٹ کیا گیا ہے۔''

یہ سن کر مریم کی آنکھیں چمک اٹھیں۔اس نے جھٹ سے''اوکے، شکریہ!'' کہا اور چمکتی آنکھوں کے ساتھ ماں باپ کے گلے لگ گئی،''امی، ابو! میری جاب لگ گئی ہے۔''پڑھنا پڑھانا مریم کا شوق تھا اور آج مریم کے دیکھے ہوئے خواب پورے ہو گئے تھے۔

وہی چنگاری تھی جس نے آج اسے گیس کے چولہے کے پاس کھڑے ہونے اور کامیابی کی بلندیوں پر پہنچنے کی ہمت دی تھی۔ وہی دھواں، جو آنکھوں کو لال کر دیتا تھا، آج اس کی یادوں میں ہمیشہ کے لیے محفوظ رہ گیا تھا۔ایکِ رہبر، ایک! نشان منزل بن کر۔۔۔

❖❖❖❖❖

لبیک اے ارض مقدس

نور کے دل کی زمین پر اداسی کا بسیرا تھا۔ گھر کے کاموں میں دل لگانے کی کوشش کی، مگر بے سود۔ آخر کار، اس نے ماں کو اطلاع دی اور اپنی سہیلی یسری کے گھر چلی گئی۔ کچھ دیر بعد دونوں ساحلِ سمندر کی طرف نکل گئیں۔ بحیرہ احمر کی لہریں نور کے قدموں کو چھو رہی تھیں جیسے اسے دلاسہ دے رہی ہوں۔ سامنے سنہری ریت، نیلا آسمان اور بے کراں سمندر تھا۔ ڈوبتے سورج کی کرنیں پانی میں سونے کی سی چمک پیدا کر رہی تھیں۔ مگر نور کی نظریں ان خوبصورت مناظر سے ہٹ کر کسی اور دنیا میں تھیں۔ اچانک اس کا دل ساکت سا ہو گیا۔ ''یہ پانی کتنا خوش نصیب ہے۔ جہاں چاہے جا سکتا ہے اور ہم؟ ہم تو اپنی ہی زمین میں قید ہیں۔''

پانی پر نظریں جمائے نور نے دل ہی دل میں عہد کیا۔ ان شاء اللہ ایک دن ہم بھی تمہاری طرح آزادی کی فضا میں سانس لیں گے اور اس کے لیے ہم اپنا خون کا آخری قطرہ بھی بہا دیں گے۔'' یہ سوچتے ہوئے نور اور یسری گھر واپس آ گئیں۔ گھر پہنچتے ہی نور نے دیکھا کہ ماں اور اس کے چھوٹے بہن بھائی بے چینی سے اس کا انتظار کر رہے ہیں۔ غزہ میں وقت کے ساتھ ساتھ یہ بےچینی ایک مستقل خوف میں بدل چکی تھی۔ اسرائیلی فوج ہر وقت گشت کرتی تھی اور کسی بھی لمحے زندگی موت میں بدل سکتی تھی۔ ماں نے سکون کا سانس لیا اور سخت لہجے میں کہا: ''بیٹا، اتنی دیر باہر نہ رہا کرو! یہاں کی فضاؤں میں ہر لمحہ موت کی بو بسی ہے۔'' نور نے مسکرا کر ماں کے گلے میں بازو ڈالی اور محبت سے کہا۔ ''امی! یہ خوف ختم کرنا ہوگا۔ ہم سب مجاہد ہیں۔ ہمیں نہیں معلوم ہماری شہادت کب اور کہاں لکھی جا چکی ہے۔ لیکن ایک بات یاد رکھیں، آپ کوئی عام ماں نہیں ہے۔ آپ فلسطینی ماں ہیں! وہ ماں، جو اپنے بیٹے کی شہادت پر آنسو نہیں شکر ادا کرتی ہے!'' ماں کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔ وہ نور کی پیشانی چوم کر بولیں۔ ''بیٹا، تمہاری باتیں تمہارے باپ اور بھائیوں جیسی لگتی ہیں!'' نور غزہ کے ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوئی تھی

جہاں شہادت وراثت میں ملتی تھی۔اس نے آنکھ کھولی تو خود کو قید میں پایا، ہوش سنبھالا تو اپنے خون میں ایک چنگاری محسوس کی۔اس کے والداور دونوں بھائی بھی اسی راستے کے مسافر تھے، جو آزادی کی طرف جاتا تھا شہادت کا راستہ! نور نے صحافت کی تعلیم حاصل کی تھی اس کے قلم میں سیاہی کے بجائے خون دوڑتا تھا۔وہ بے باک صحافی تھی، جو اسرائیلی مظالم کو سفاک سچائی کے ساتھ دنیا کے سامنے لاتی تھی۔اس کے الفاظ دشمن کے دل میں خنجر کی طرح اترتے تھے۔ وہ محاذ پر بھی جاتی تا کہ خود ظلم کا مشاہدہ کرے اور حقیقت کو بے خوفی سے بیان کرے۔''وہ کہتے ہیں ہم نے جنگ بندی کر لی، ہم زیادہ ظلم نہیں کرتے!'' یہ سنتے ہی نور غصے سے محاذ پر پہنچ جاتی۔ ہر طرف تباہ حال مکانات، شہیدوں کے جنازے، ماؤں کی چیخیں اور یتیم بچوں کے آنسو دیکھ کر اس کا قلم مزید تیز ہو جاتا۔وہ دیکھتی تا کہ دنیا سن لے تا کہ عالمِ اسلام جاگ جائے تا کہ کوئی تو قبلۂ اول کی آزادی کے لیے آواز اٹھائے۔ یہ وہ زمین ہے جہاں ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کے قدم پڑے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں آسمان سے احکام نازل ہوئے۔مگر آج یہاں خون بہہ رہا ہے۔چیخیں بلند ہو رہی ہیں اور دنیا خاموش تماشائی بنی بیٹھی ہے!''نور کا دل جلنے لگا۔ چند دن بعد وہ ایک رپورٹنگ کے مشن پر نکلی۔ یہ جگہ کبھی خوبصورتی میں بے مثال تھی، مگر آج دھول اور مٹی میں اٹی ہوئی تھی۔نور نے آسمان کی طرف دیکھا اور آنکھیں بند کر کے دل میں دُعا کی:''اے کائنات کے مالک! ہمارے وطن کو آزاد کر دے!'' واپسی پر جیسے ہی نور گھر پہنچی، ماں کی آنسو بھری آنکھوں نے اس کا استقبال کیا۔دل بے اختیار دھڑکا۔نور نے ماں کو گلے لگایا اور گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا:''امی، ابو اور بھائی کہاں ہیں؟ اور یہ آنسو؟'' ماں نے کانپتی آواز میں جواب دیا:''بیٹا، تمہارے ابو اور بھائی وہ دونوں شہید ہو چکے ہیں۔'' یہ سنتے ہی نور آہستہ آہستہ زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔لمحہ بھر کے لیے دل کی دھڑکن بھی رک سی گئی۔آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے۔لیکن اچانک اندر سے ایک سرگوشی سنائی دی۔''تمہارا آئیڈیل تو زینب بنتِ علیؑ ہیں۔تم تو ان سے بے حد محبت کرتی ہو، پھر یہ آنسو؟ کیا یہی محبت کا ثبوت ہے؟''نور نے لرزتے ہاتھوں سے اپنے آنسو پونچھے، سر اٹھایا اور دل میں دُعا کی:''اے اللہ! مجھے صبرِ زینب

عطا کر!'' پھر ماں، بہن اور بھائی کو سینے سے لگایا اور مضبوط لہجے میں کہا: ''امی ہمیں غم نہیں کرنا چاہیے۔ جتنا بڑا مقصد ہو، اتنی ہی بڑی قربانی مانگتا ہے۔ ہم ضرور کامیاب ہوں گے۔ ایک دن ہم مسجدِ اقصیٰ میں اسلام کا پرچم لہرائیں گے!'' ماں نے لرزتے ہونٹوں سے آمین کہا۔ پیچھے سے یسریٰ کی آواز آئی: ''نور، ہم کب آزاد ہوں گے؟ کب ہم بے خوف ہو کر ہنس سکیں گے؟ کب ہمارے گھر محفوظ ہوں گے؟'' نور نے یسریٰ کا ہاتھ تھاما اور مضبوط لہجے میں کہا۔ ''یسریٰ، صبر رکھو۔ اللہ کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ ہمارا ایمان، ہمارا جذبہ اور ہمارا اللہ، ہمیں آزاد کرے گا۔ ایک دن ہمارا فلسطین ہمارے قہقہوں سے گونجے گا۔ ہمارے چہرے خوشی سے دمکیں گے۔ ہمارے بچے آزادی کے نغمے گائیں گے اور اگر ہم نہ بھی رہے تو بھی ہماری قربانی رنگ لائے گی!'' نور کے دل میں انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی۔ وہ پہلے بھی قلم کی جنگ لڑ رہی تھی، لیکن اب، اب وہ ایک نئی جنگ کا حصہ بننے جا رہی تھی۔ کچھ دن بعد ٹی وی پر ایک خبر چلی: ''غزہ کے جنوب میں اسرائیلی بمباری میں شہید ہونے والوں میں ایک اور بہادر صحافی شامل نور سحر شہید ہوگئی!'' یہ سن کر یسری کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور وہ بے، ہوش ہوگئی۔ نور کی ماں نے اپنے آنسو پونچھے اور آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''یا اللہ! میں نے اپنے بیٹے، اپنے شوہر اور اب اپنی بیٹی کو تیرے راستے میں قربان کر دیا۔ میں تیری رضا پر راضی ہوں!'' غزہ کی زمین ایک اور شہید کی خوشبو سے مہک اٹھی۔ کیونکہ یہاں کے لوگ غلامی میں جینے کے بجائے کربلا والوں کی راہ پر چل کر شہادت کو گلے لگاتے تھے۔ ''لبیک اے ارضِ مقدس، ہم تجھے آزاد کروا کر رہیں گے۔''

❖❖❖❖❖

خوابوں کا سوداگر

سورج مشرق سے نکل کر مغرب کی طرف محوِ سفر تھا، اس کا سفر مکمل ہونے کو تھا، اپنی آخری کرنیں بکھیر کر دن کو الوداع کہہ رہا تھا۔ آسمان نے بھی اپنے رنگ بدل لیے تھے، کہیں سرخی چھائی ہوئی تھی، کہیں نیلاہٹ تھی اور کہیں کہیں بادل بھی دکھائی دے رہے تھے۔ یہ سردیوں کے دن تھے۔ حامد چھت پر کبوتروں کو دانہ ڈال رہا تھا اور ساتھ ہی غروبِ آفتاب کی آخری کرنوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ کچھ کبوتر دانہ چگنے میں مصروف تھے تو کچھ فضاؤں میں اڑ رہے تھے۔ اچانک ایک کبوتر دانہ چھوڑ کر اڑنے لگا۔ اس منظر نے حامد کو ماضی میں پہنچا دیا، جہاں وہ مختلف لوگوں کے خواب خریدا کرتا تھا۔ وہ خوابوں کا بیوپاری بن چکا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے اسے اس کام میں مزہ آنے لگا تھا۔

حامد کے کانوں میں کئی آوازیں گڈمڈ ہونے لگیں۔ ''حامد بھائی، میں نے سنا ہے آپ لوگوں کے خواب خریدتے ہیں؟'' یہ 17 سالہ زلفی کی آواز تھی۔

''حامد صاحب، سنا ہے آپ خوابوں کے خریدار ہیں؟'' یہ کالج کی طالبہ ثناء تھی۔

''جی، آپ نے سچ سنا ہے۔'' حامد بولا۔ ''زلفی، کون سا خواب ہے جو تم بیچنا چاہتے ہو اور کیوں؟''

''میں میٹرک میں پڑھ رہا ہوں۔ میرا اور میرے والدین کا خواب تھا کہ میں بہت پڑھوں، ایک کامیاب سرجن بنوں اور اپنے پسماندہ علاقے کی خدمت کروں۔ لیکن۔۔۔'' زلفی کی آواز بھرا گئی۔ ''لیکن کیا؟'' حامد نے پوچھا۔

''لیکن اس کمر توڑ مہنگائی میں صرف ابو کا کمانا، آٹھ افراد کو پالنا، وہ بھی ایک مزدور کے لیے بہت مشکل ہے۔ اس لیے میں نے سوچا کہ اپنا یہ مہنگا خواب بیچ دوں تاکہ ابو کا ہاتھ بٹا سکوں۔'' کہتے کہتے زلفی کی آواز رندھ گئی۔

مگر حامد نے اثر لیے بغیر کہا، ''ٹھیک ہے، یہ لو قیمت!'' اور خواب خرید لیا۔

پھر ثناء کی آواز ابھری۔ ''حامد صاحب، آپ خواب خریدتے ہیں؟''

''جی، آپ کیا بیچنا چاہتی ہیں؟''

''میری خواہش تھی کہ میں پسند کی شادی کروں۔''

''کیوں؟'' حامد نے سوال کیا۔

''میرے ماں باپ کی شادی گھر والوں کی مرضی سے ہوئی تھی، لیکن ان کے دل اور مزاج کبھی نہیں مل سکے۔ گھر میں آئے دن جھگڑے ہوتے ہیں، تو تو میں میں چلتی رہتی ہے۔ اس کا اثر ہم چار بہن بھائیوں پر بہت برا پڑا۔ میرا بھائی گھر سے بھاگ گیا، بہن گھر سے باہر رہنے کو ترجیح دیتی ہے اور میں۔۔۔ میں نے سوچا تھا کہ اپنی زندگی اپنی مرضی سے گزاروں گی، لیکن۔۔۔''

''لیکن کیا؟''

''لیکن وہ ماں باپ جو ہر بات پر ایک دوسرے پر تنقید کرتے تھے، وہ اس بات پر ایک ہو گئے کہ پسند کی شادی کا نتیجہ درست نہیں ہوتا اور۔۔۔ اور ابھی میری شادی کی عمر نہیں، مجھے پڑھنا چاہیے!'' کہتے کہتے ثناء کی آنکھیں برسنے لگ گئیں۔

''اب، جب یاد آیا، تو دل میں ایک عجیب سی ٹیس اٹھی۔ انسان کی بے بسی پر، زمانے اور اپنوں کی بے رحمی پر۔۔۔''

حامد نے اڑتے کبوتر کو دیکھا۔ وہ جب چاہے، پر پھیلائے، فضا میں بلند ہو جاتا ہے اور اپنی پسند کی کسی اونچی جگہ جا بیٹھتا ہے۔ مگر انسان؟ وہ جب بھی پرواز کا خواب دیکھتا ہے، کوئی نہ کوئی رشتہ، کوئی نہ کوئی جذباتی حوالہ، اس کے پر کاٹ دیتا ہے۔ زمین پر گرا دیتا ہے، تاکہ وہ پرواز کی جسارت سے باز رہے۔۔۔ آہ، انسان!

❖❖❖❖❖

آخری عشرہ، جب دل بدل گیا

رات کا آخری پہر تھا۔فضا میں گہری خاموشی تھی،صرف کہیں دُور اذان کی ہلکی سی آواز سنائی دے رہی تھی۔آسمان پر بادل چھائے تھے، جیسے ستارے بھی کسی عبادت میں مشغول ہوں۔ رقیہ جائے نماز پر دو زانو بیٹھی تھی۔آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور دل کسی بے خودی میں محوِ مناجات تھا۔آج اس کا دل بھی پانی بن کر بہہ رہا تھا۔وہ خود کو ایک نئی رقیہ کے طور پر دیکھ رہی تھی۔ایک بدلی ہوئی رقیہ! یہ کیسا احساس تھا؟ یہ کیسی بے اختیاری تھی جو اسے سکون اور خوشی دے رہی تھی؟ اس سے پہلے کبھی وہ ایسے جذبات سے نہیں گزری تھی۔کیوں؟ کیونکہ اس نے پہلے کبھی اللہ سے اتنے قریب جانے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔بس ایک رسمی سا تعلق تھا اس کا رب سے۔نماز بھی آخری وقت میں جلدی جلدی ادا کرتی،سنتیں چھوڑ دیتی،تلاوت کے لیے وقت نہیں نکالتی۔ دن بھر یونیورسٹی کی مصروفیاترات کو موبائل میں وقت ضائع کرنا، نیند اور غفلت میں فجر قضا کرنا۔۔۔یہی تو تھا اس کی زندگی کا معمول! لیکن سلامت رکھے ماجبن کو۔۔ اس کی بہترین سہیلی، جو ہمیشہ اسے سمجھاتی تھی۔ایک دن جب ماہ جبین نے رمضان،عبادت اور اللہ کی قربت پر ایسا خوبصورت اور مؤثر انداز میں لیکچر دیا کہ رقیہ کا دل جیسے کسی زنجیر سے آزاد ہو گیا۔اور اب یہ آخری عشرہ تھا۔۔۔اور رقیہ خود کو بالکل بدلا ہوا محسوس کر رہی تھی۔وہ جو پہلے سحری کے بعد موبائل میں وقت ضائع کر دیتی،آج رات کے آخری پہر میں رو رہی تھی۔وہ جو پہلے جلدی میں نماز ادا کرتی،آج دل کی گہرائیوں سے دُعا مانگ رہی تھی۔وہ جو کبھی اپنے گناہوں پر غور بھی نہیں کرتی تھی،آج اس کا دل ''ربِّ اغفرلی،ربِّ اغفرلی'' کی صداؤں سے بھرا ہوا تھا۔اس کے لبوں سے بے اختیار دُعا نکلی: ''یا اللہ! یہ رات یہیں رک جائے۔۔۔مجھے تیری قربت میں کچھ دیر اور ٹھہرنے دے! مجھے طویل سجدے کی توفیق دے! میں اس سکون کو، اس محبت کو، اس روشنی کو کھونا نہیں چاہتی!'' یہ وہی رقیہ تھی جو کبھی نماز اور روزے سے بھاگتی

تھی۔مگر آج، آخری عشرے نے اسے بدل کر رکھ دیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے بے سمت کو سمت مل گئی ہو، پیادے کو سوار اور بے آسماں کو آسمان مل گیا ہو! سب سے بڑھ کر اللہ کی محبت مل گئی ہو! اب اس کی عبادت، اس کی دُعا محض رسمی نہیں رہی تھی، بلکہ دل کی پوری رضا کے ساتھ! تھی۔ وہ غفلت میں نہیں، بلکہ محبت میں جھک رہی تھی۔ یہ آخری عشرہ۔۔۔رقیہ کے لیے ہفت اقلیم کی دولت لے آیا تھا۔

❖❖❖❖❖

خوف اور خد

زہرا اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مار رہی تھی، لیکن اسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کا جسم پسینے میں شرابور تھا گلا خشک ہو چکا تھا اور پیاس شدت اختیار کر چکی تھی۔ مگر اس بے بسی میں نہ تو وہ خود کو اس اندھیرے سے نکال پا رہی تھی اور نہ ہی ایک گھونٹ پانی ہی میسر تھا۔ زہرا نے ادھر ادھر دیکھنے کی کوشش کی، مگر کچھ نظر نہ آیا۔ خوف نے اس کے دل میں ایک عجیب وسوسہ ڈال دیا۔ کہیں میں اندھی تو نہیں ہو گئی؟ کہیں میری بینائی تو نہیں چلی گئی؟ یہ سوچ آتے ہی زہرا کے قدم جیسے زمین میں دھنس گئے۔

''یا اللہ! یہ خواب ہو، حقیقت نہ ہو! میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں، ان کا خیال کون رکھے گا؟ ان کے باپ کو تو کوئی پروا ہ نہیں! اگر مجھے کچھ ہو گیا تو میرے بچے کہاں جائیں گے؟''

کہتے کہتے اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ زہرا نے اٹھنے کی کوشش کی، مگر جسم نے اس کا ساتھ نہ دیا۔ خوف مزید بڑھنے لگا۔

''کہیں میں مر تو نہیں گئی؟ کیا میں قبر میں ہوں؟'' جیسے ہی یہ خیال اس کے ذہن میں آیا، ایک ٹھنڈی، لہر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سرایت کر گئی۔ اسی لمحے، اس کے کانوں میں ایک سرگوشی گونجی:

''ہاں، تم قبر میں ہو، وہ بھی اندھیری!'' زہرا کانپ اٹھی۔

''کیوں؟ میں تو اپنے آرام دہ بستر پر تھی، روشنی تھی، ٹھنڈا پانی تھا، میرے بچے میرا شوہر سب ساتھ تھے۔۔۔ پھر یہ اندھیرا، یہ پیاس، یہ تنہائی کیوں؟''

وہی سرگوشی پھر سنائی دی: ''وہاں تمہارے پاس سب کچھ تھا، مگر تم غرور میں مبتلا تھیں۔ تم نے کبھی یہاں کے بارے میں نہیں سوچا، یہاں کی ضرورتوں میں سستی برتی۔ تمہیں اپنے مال،

اپنے شوہر، اور بچوں پر بڑا ناز تھا، مگر تمہاری ساری کوششیں دنیا کے لیے تھیں۔ آج یہی تمہاری کمائی ہے!''

زہرا سہم گئی، لرزتی آواز میں بولی۔''یہاں کے لیے کیا بھیجنا چاہیے تھا؟ تمہیں نہیں معلوم؟ افسوس! اتنی غفلت؟ کیا تمہیں معلوم ہے کہ تمہیں کس نے پیدا کیا؟ جی، اللہ نے! اور تم کس کے ذریعے دنیا میں آئیں؟ ماں باپ کے ذریعے۔ تو پھر تم اپنے ماں باپ کو کیسے بھول سکتی ہو؟ نہیں، میں انہیں کیسے بھول سکتی ہوں، وہ میرے ماں باپ ہیں! تو پھر تم نے اپنے خالق کو کیوں بھلا دیا؟ اگر اسی طرح اپنے رب کو یاد رکھتیں، اس کے احکام پر عمل کرتیں، تو آج اس اندھیرے میں نہ ہوتیں! تم نے باقی سب کو یاد رکھا، مگر اللہ کو نہیں! نماز کو وقت کا ضیاع سمجھا، روزے کو محض بھوکا رہنے کا نام دیا، صدقہ و خیرات کو مال میں کمی کا سبب جانا، تمہارے پاس قرآن کے لیے وقت نہ تھا، نہ کسی کو پانی پلایا، نہ کسی کے دل میں جگہ بنائی! تمہارے دل میں کبھی خوفِ خدا نہیں آیا، ورنہ تم اس کے احکام پر چلتی اور اپنی قبر کو یوں تاریک نہ چھوڑتیں!''

زہرا پر کپکپی طاری ہوگئی، اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا مزید گہرا ہونے لگا۔''تمہیں دنیا کی فکر تھی، دنیا والوں کی پرواہ تھی، دنیا کو سنوارنے میں لگی رہیں، مگر اپنی آخرت کو بھول گئیں! اب یہ اندھیرا تمہاری اپنی کمائی ہے اور تمہیں اسی میں رہنا ہے!'' زہرا کی گھگھی بندھ گئی۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ اچانک کسی کے رونے کی آواز آئی اور۔۔۔اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ حیران و پریشان ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ وہ قبر میں نہیں، بلکہ اپنے گھر میں، اپنے بستر پر تھی۔ پہلو میں اس کی چھوٹی بیٹی رو رہی تھی۔ زہرا نے اسے سینے سے لگا لیا، مگر اس کا جسم اب بھی لرز رہا تھا۔ جو کچھ ابھی ابھی دیکھا، وہ صرف ایک خواب تھا۔۔۔لیکن حقیقت کا آئینہ بھی۔۔۔

❖❖❖❖❖

بند دریچے

سدرہ ایک ذہین طالبہ تھی، مگر ہمیشہ خود کو کمتر سمجھتی۔ اس کے اساتذہ اور گھر والے سب اسے قابل کہتے، مگر وہ خود کو زیرو نمبر دیتی۔ وہ خوبصورت بھی تھی، قد کاٹھ بھی اچھا تھا، مگر ہمیشہ یہی سوچتی کہ وہ بس ایک عام سی لڑکی ہے۔ وہ کھانا بھی اچھا بنا لیتی، مگر جب بہن کہتی، ''باجی، آج رات کا کھانا تم بنالو!'' تو وہ کہہ دیتی، ''نہیں، میں نہیں بنا سکتی، تم ہی بنالو!''

اس کی خواہشات بڑی تھیں، وہ ایک نامور سرجن بننا چاہتی تھی، مگر اس نے خود ہی خود کو یہ باور کرالیا تھا کہ وہ اس قابل نہیں۔ کبھی میک اپ کرنا چاہتی، مگر آئینے میں خود کو دیکھ کر کہتی، ''جتنا بھی سنوار لو، رہو گی عام سی لڑکی!'' یوں اپنی ہر خواہش کا خود ہی گلا گھونٹ دیتی۔

زہرا، اس کی بہترین دوست، ہمیشہ اسے سمجھاتی، ''سدرہ! تم باصلاحیت ہو، تم سب کچھ کر سکتی ہو، بس خود پر یقین پیدا کرو!''

مگر سدرہ ہمیشہ مایوسی سے کہتی، ''زہرا، مجھے لگتا ہے کہ میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی، مجھ میں کوئی خاص بات نہیں!''

گھر میں سب اس پر فخر کرتے، ماں بھی سمجھاتی۔ ''میری بیٹی کسی سے کم نہیں، اللہ نے ہر کسی میں کوئی نہ کوئی خوبی رکھی ہے۔'' اگر سدرہ اپنی ہی سوچ کی زنجیروں میں قید رہی۔

یونیورسٹی میں اس کی ملاقات احتشام حسین سے ہوئی، جو ایک ذہین اور ملنسار لڑکا تھا۔ دونوں کے درمیان بات چیت ہونے لگی اور احتشام نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ سدرہ کے اندر بے پناہ صلاحیت ہے، مگر وہ خود کو ہی پیچھے رکھتی ہے۔ ایک دن اس نے سدرہ سے کہا۔ ''تم خود کو اتنا کمزور کیوں سمجھتی ہو؟ تمہیں پتا بھی ہے کہ تم کتنی قابل ہو!؟ تم نے اپنی کامیابی کے ہر دریچے پر خود ہی تالے لگا رکھے ہیں۔''

یہ جملے سدرہ کے دل میں گونجنے لگے۔ اس نے پہلی بار سوچا، ''کیا واقعی میں خود کو پیچھے

دھکیل رہی ہوں؟ کیا میں اپنی ہی دشمن بن بیٹھی ہوں؟''

آہستہ آہستہ، سدرہ نے خود کو بدلنے کا فیصلہ کیا۔ اب جب بہن کہتی۔ ''باجی، آج کھانا تم بنا لو!'' تو وہ خود ہی بریانی بنانے کھڑی ہو جاتی۔

جب وہ آئینے میں خود کو دیکھتی، تو سوچتی۔ ''میں جیسی بھی ہوں اچھی ہوں!''

یونیورسٹی میں بھی اس نے خود پر اعتماد کرنا شروع کر دیا۔ ہر قدم پر اس نے اپنے اندر چھپے خوف کے بند دریچوں کو کھولنا شروع کیا اور جب ایک دروازہ کھلا تو باقی بھی خود بخود کھلتے چلے گئے۔! کچھ سال بعد، آج وہ ایک کامیاب سی۔ ایس۔ ایس افسر تھی۔ زہرا اس سے ملنے آئی اور مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تو، سدرہ افسر جب ہم کہتے تھے کہ تم سب کچھ کر سکتی ہو، تب یقین نہیں آتا تھا، اب آیا؟''

سدرہ نے مسکرا کر زہرا کو گلے لگایا اور بولی۔ ''ہاں، زہرا! آج جب سارے بند دریچے کھل گئے، تو محسوس ہوا کہ میں غلط تھی۔ میں خود اپنی راہ میں رکاوٹ تھی۔ اصل میں محنت ہماری ہوتی ہے، مگر کامیابی اللہ دیتا ہے۔''

اسی لمحے فون بجا، سدرہ نے اسکرین پر نظر ڈالی تو احتشام حسین کا نام چمک رہا تھا۔ اس نے کال ریسیو کی، دوسری طرف سے خوشگوار آواز آئی۔ ''مبارک ہو، سدرہ! میں جانتا تھا کہ تم کر سکتی ہو۔ تم نے ثابت کر دیا!'' سدرہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''شکریہ احتشام! شاید تمہاری باتوں نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا اور آج میں یہاں ہوں۔''

احتشام ہلکا سا ہنسا، ''تمہاری کامیابی تمہاری اپنی محنت کی بدولت ہے، میں نے تو بس یاد دلایا تھا کہ تم کتنی قابل ہو۔''

سدرہ نے فون بند کیا اور زہرا کے ساتھ کھڑکی کے قریب جا کر کھڑی ہو گئی۔ باہر ہوا کے ساتھ پردے ہل رہے تھے۔ وہ بند دریچے جو سالوں سے اس کے دل و دماغ میں قید تھے، آج وہ سب کھل چکے تھے۔

❖❖❖❖❖

احساس کمتری

یہ ایک بھراپرا گھر تھا، ہمیشہ جشن کا سماں رہتا۔کوئی آتا، کوئی جاتا، کسی کو چائے چاہیے ہوتی، کسی کو استری شدہ کپڑے، تو کسی کو بازار جانے کی جلدی۔ ہر وقت ہلچل، شور، قہقہے، مگر اس سب کے بیچ ایک ہستی ایسی بھی تھی جس کا نہ کوئی خاص شوق تھا، نہ کوئی سہیلی، نہ کہیں جانے کی خواہش۔ ماہین ہمیشہ اپنے کام سے کام رکھتی۔صبح سب سے پہلے اٹھتی، نماز پڑھتی اور ناشتے کی میز پر جب سب ہنسی مذاق میں مصروف ہوتے، وہ خاموشی سے ناشتہ کر کے اسکول جانے کی تیاری میں لگ جاتی۔ تیار ہو کر حسن، سکینہ، سمیہ اور قمر کا انتظار کرتی۔ یہ گھر تین خاندانوں پر مشتمل تھا۔تایا کی فیملی میں چار بچے تھے: حسن، رقیہ، عادل اور لبنیٰ۔ چچا کے دو بچے تھے، سکینہ اور ساجد اور ماہین کی اپنی فیملی میں وہ، قمر اور سمیہ شامل تھے۔حسن اور رقیہ یونیورسٹی جاتے تھے، جبکہ لبنیٰ، سمیہ اور ساجد ابھی چھوٹے تھے۔ عادل، سکینہ اور ماہین میٹرک کے طالبعلم تھے اور تینوں کو ماہین کے ابا احسان، اسکول چھوڑنے جاتے۔بچوں کی وجہ سے گھر میں ہر وقت رونق لگی رہتی۔کبھی جھگڑا، کبھی صلح، کبھی شرارتیں، کبھی محبت کے اظہار۔سب اپنی جگہ خوش وخرم تھے، سوائے ماہین کے۔وہ پہلے ایسی نہ تھی، وہ بھی ہنستی تھی، شور مچاتی تھی، سب کے ساتھ کھیلتی تھی، مگر نہ جانے کب اور کیسے وہ خاموش ہوتی گئی۔

ماں باپ نے سمجھا، شاید بڑھتی عمر کے ساتھ سنجیدگی آ رہی ہے، مگر دادی کی جہاں دیدہ نظروں سے کچھ چھپا نہ تھا۔وہ ہر بچے پر گہری نظر رکھتی تھیں۔حسن کو آنے میں دیر کیوں ہوئی؟ ساجد کیوں رو رہا ہے؟ سکینہ نے کھانے میں دلچسپی کیوں نہیں لی؟ یہاں تک کہ بہوؤں کا بھی خیال رکھتی تھیں، اسی لیے سب بہوئیں انہیں ساس کم اور ماں زیادہ مانتی تھیں۔مگر ماہین کی خاموشی نے انہیں تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔

جب ماہین اسکول سے آتی، دادی اسے اپنے پاس بٹھا لیتیں۔ ''ہمارے زمانے میں ہم

اسکول میں بہت شرارتی ہوتے تھے، تم کیا کھیلتی ہو؟'' وہ پوچھتیں۔ ''دادی، میں بڑی ہوگئی ہوں، کھیلنے کی عمر کہاں رہی؟''

ماہین دھیمی آواز میں کہتی۔ ''ارے نہیں، ابھی تو تمہاری کھیلنے کی عمر ہے! ایسے سنجیدہ ہوکر مت بیٹھا کرو، ہنسو، شور مچاؤ، سب کے ساتھ گھلا ملا کرو۔''

دادی شفقت سے کہتیں، مگر ماہین بس مسکرا کر اٹھ جاتی۔ رات کو نو بجے دادی کے حکم پر دسترخوان بچھایا جاتا، سب مل کر کھاتے۔ دادی کا ماننا تھا کہ مل کر کھانے میں برکت اور محبت دونوں بڑھتی ہیں۔ کھانے کے بعد سب اپنے کمروں میں چلے جاتے، بچے پڑھنے بیٹھ جاتے۔

ماہین اکثر دادی کے پاس ہی بیٹھی رہتی۔ دادی کبھی نصیحت کرتیں، کبھی پرانے قصے سناتیں۔ مگر ساتھ ہی وہ ماہین کی خاموشی کو محسوس بھی کر رہی تھیں۔ کبھی رقیہ یونیورسٹی کی باتیں کرنے آتی، کبھی لبنیٰ اپنی سہیلیوں کے قصے سناتی، مگر ماہین بس خاموشی سے سب سنتی رہتی۔

''ماہین، کیا ہوا؟ طبیعت ٹھیک ہے؟'' دادی نے ایک دن اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ماہین نے ہلکے سے سر ہلایا۔ ''جی دادی، میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' مگر اس کے جھکے ہوئے چہرے میں کچھ اور ہی کہانی لکھی جا رہی تھی۔

''بیٹا، خاموشی اچھی چیز ہے، مگر تب نہیں جب وہ انسان کو اندر سے توڑنے لگے۔ تم سب کے ساتھ ہنستی کیوں نہیں؟'' دادی نے نرمی سے پوچھا۔

ماہین نے نظریں جھکا لیں، جیسے کوئی جواب ہو مگر وہ کہہ نہ پا رہی ہو۔ ''زندگی سب کے ساتھ جینے کا نام ہے، خود کو تنہا مت کرو۔ جو دل میں ہے، اسے نکالو، کسی سے کہو۔ ورنہ ایک دن ایسا آئے گا کہ تمہیں خود بھی سمجھ نہیں آئے گا کہ تم نے کیا کھو دیا۔''

ماہین کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی آ گئی۔ ''دادی! آپ کو لگتا ہے میں سب سے الگ ہوں۔ ہاں اور یہ تمہاری طبیعت کا حصہ نہیں، بلکہ تم نے خود کو سب سے الگ کر لیا ہے۔'' دادی نے پیار سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''کیا کوئی بات ہے جو تمہیں ستا رہی ہے؟'' ماہین نے ایک لمحے کو آنکھیں بند کیں، جیسے کسی اندرونی جنگ سے گزر رہی ہو۔ پھر دھیرے سے بولی، ''دادی،

مجھے لگتا ہے میں کسی سے کم ہوں۔ میرے پاس نہ حسن کی طرح اعتماد ہے، نہ رقیہ کی طرح ذہانت، نہ لبنیٰ اور سکینہ جیسی خوش مزاجی۔ میں بس ایک عام سی لڑکی ہوں، جو کسی کو یاد بھی نہیں آتی۔"

دادی نے گہری سانس لی، پھر مسکرا کر بولیں، "یہ احساسِ کمتری تمہیں کہیں نہیں لے جائے گا، بس تمہیں مزید تنہا کر دے گا۔ ہر انسان کی اپنی خوبیاں ہوتی ہیں، اپنی طاقتیں، اپنا ایک رنگ۔ تم نے کبھی خود کو سمجھنے کی کوشش کی؟ تم سب سے مختلف ہو، اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم کم ہو۔ بس اپنی پہچان تلاش کرو، تمہیں خود اپنی اہمیت کا اندازہ ہو جائے گا۔" ماہین خاموش رہی، مگر اس کی آنکھوں میں ایک نیا احساس ابھرنے لگا تھا۔ شاید وہ پہلی بار خود کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ کہیں نہ کہیں، دادی کی باتوں نے اس کے دل پر اثر کر ہی دیا تھا۔

❖❖❖❖❖

قاتل

جانتی ہو تم نے میرے ساتھ کیا کیا ہے؟ تم قاتل ہو! میرے دل کی، میری سوچوں کی، میر یار مانوں کی نجانے دنیا کی عدالتیں صرف گردن مارنے والوں کو ہی سزا کیوں سناتی ہیں؟ ان لوگوں کو سزا کیوں نہی دی جاتی جو دوسروں کو زندہ رکھ کے قتل کرتے ہیں؟ عجب دستور دنیا ہے۔

محبت کے نام پر ایک انسان کی اندرونی دنیا کا قتل عام کر دیا جاتا ہے لیکن اس کو نہ سزا ہوتی ہے نہ کسی عدالت کا سامنا کرنا پڑتا ہے، خود تو وہ خوش خوش اپنی دنیا آباد کر لیتا ہے جبکہ کسی کو چاہ کی راہ پر ڈال کر سہارا دینے کے نام پر بے سہارا کر کے کسی کے ارمانوں کو اپنے قدموں تلے روند ڈالتا ہے۔

محبت نام ہی کتنا عجب ہے۔۔۔ ہے نا۔۔۔ جسے آپ جانتے نہیں کچھ عرصے کے بعد اسی کے بغیر سانس بوجھل اور زندگی بے کار لگنے لگتی ہے۔۔۔

بلال حیدر اور سیما آفتاب دونوں شاعر تھے۔۔۔ دن رات الفاظ سے کھیلنے والی ہستیاں۔ کہتے ہیں نا کہ شاعر لوگ بہت حساس ہوتے ہیں۔ اُسی حساسیت پر ان سے لفظ اگتے ہیں کیونکہ ایسے لوگ ہر منظر کو پوری جزئیات کے ساتھ اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے ایسے لوگ شاعر بن جاتے ہیں کہیں ان کے الفاظ خوشبو بکھر رہے ہوتے ہے تو کہیں آنسوؤں کی بارش برساتے دکھائی دیتے ہیں۔ بلال حیدر اور سیما آفتاب کا تعلق بھی اسی خوب صورت سر زمین سے تھا جہاں الفاظ کی کاشتکاری ان کی دولت تھے۔

مختلف مشاعروں میں شامل ہوتے اور اپنے اپنے الفاظ کے جادو بکھیرتے۔۔۔ کب دونوں ایک دوسرے کی الفاظ سے گھائل ہوئے ان کو جب پتہ چلا تو ان دونوں کو محسوس ہوا۔ اب الفاظ ہی ایک دوسرے کی دلوں میں نہیں بلکہ خود بھی ایک دوسرے کی دل میں بس گئے ہیں۔

یہ احساس دونوں کے لیے بہت خوش کن تھا۔۔۔ایک ہی سوچ اور ایک ہی راہ پر چلنے والوں کے دل بھی مل گیا تو سیما آفتاب کو بلال حیدر کی پرسوز آواز و انداز پہ دل ہار گئی تھی تو بلال حیدر کو سیما آفتاب کی مسکراہٹ اور الفاظ کی ہیرا پھری نے دل چھین لیا تھا۔۔۔یوں محبت کی ابتدا ہوئی اور ان کی غزل و اشعار میں ایک نیا ترنم آ گیا۔۔۔۔

ان کے غزل اور گائیکی لوگوں کے دلوں پر اپنا نقش چھوڑ جاتے۔۔۔دونوں داد و تحسین وصول کرتے بہت خوش خوش اپنے نئے جذبہ و احساس سے لطف اندوز ہوتے ایک دوسرے سے گھنٹوں فون پر ہلکی پھلکی گفتگو کرتے اور الفاظ پر گفتگو کرتے تاکہ کسی بھی طرح سے رابطہ بحال رہے۔۔یوں ایک دوسرے کی سنگت میں پھولوں پر خوشبو پر اور محبت پر سیر حاصل گفتگو کرتے ہوئے ایک دن بلال حیدر نے سیما آفتاب سے کہہ دیا ہم کب تک اس طرح فون پر بات کرتے رہیں گے میں چاہتا ہوں اس رشتے کو پکا کروں تاکہ ہم دونوں کی محبت ہمیشہ کے لیے قائم رہے۔۔تم بتاؤ تو میں تمہاری گھر رشتہ بھیجوں؟

سیما نے سوچ کے جواب دینے کا کہا ایک دو دن بعد بلال حیدر نے کال پر سیما کا روکھا انداز دیکھ کر پوچھا کہ ''کیا بات ہے؟''

سیما کہنے لگی کہ ''کچھ نہیں بس طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

اس کے بعد وہ بات کرتی تو بھی عجیب بے ڈھنگے پھنسے، کبھی جواب دے دیتی کبھی جواب دیئے بغیر فون بند کرتی۔ بلال حیدر پریشان رہنے لگے۔ آخر ہوا کیا ہے؟ وہ سوچنے لگتے اتنے محبت سے پیش آتے آتے وہ کیوں بدلنے لگی۔ جب محبت کی آگ دونوں طرف برابر لگی ہوئی ہے اور میں تو کوئی دل لگی بھی نہیں کر رہا سچ میں چاہ کے اپنانا بھی چاہ رہا ہوں لیکن سیما دن بدن دُور ہو رہی تھی۔

ایک دن بلال کی کال پر اس کو بے نقط سنانے لگی۔۔۔حساس اور نرم دل شاعرہ نے بلال حیدر کے خوبصورت دل اور جذبوں کو محبت کی جادوگری میں جکڑ کر بُری طرح توڑ ڈالا۔۔۔وہ شاعرہ جو بلال حیدر کی پرسوز آواز پر مری تھی خود بلال کے لیے مرگئی۔۔۔

بلال حیدر کی پر سوز آواز اور الفاظ کی آبیاری کے لیے کچھ اور درد دے کر خود اس کو چھوڑ گیا۔۔۔ سیما آفتاب کی جدائی نے بلال حیدر کو اور بھی پاپولر کر دیا جب خوبصورت آواز میں درد بھر جاتا ہے تو الفاظ دلوں کو چیر کے رکھ دیتا ہے یہی شاعر بلال حیدر کے ساتھ ہوا۔

❖❖❖❖❖

انسان اور جنات

قصے کہانیوں میں تو ہم نے بہت سنی تھی، جن اور پریوں کے بارے میں اور اکثر حیران ہو کر سوچتی، کیا سچ میں، ایسا کوئی مخلوق بھی ہے اور یقین پھر بھی نہیں آتی تھی۔ہم ان مخلوقات پر کبھی بھی یقین نہ کرتی، لیکن کچھ ایسے واقعات ظہور پذیر ہوا اور ہمیں یقین آ گیا۔ایسے مخلوق بھی ہے جن سے انسانوں کا ٹکراؤ کہیں بھی کبھی بھی ہو سکتا ہے اور ہوا بھی واقع کچھ یوں ہیں، ہماری گاؤں میں ایک لڑکی بیماری ہوئی تھی اور وہ باتیں بھی کچھ الٹی سیدھی کرتی تھی، ساتھ میں وہ ہمیشہ بن ٹھنکے رہتی، وہ نئے کپڑے سبزہ زار اور پھولوں کو بہت پسند کرتی تھی اور ان چیزوں سے کھیلنے میں لگی رہتی، ساتھ میں وہ غیر شادی شدہ بھی تھا، تو سب اس کو برا بھلا کہتے تھے۔ پتہ نہیں کیوں وہ اتنے بن ٹھن کے رہتی ہے ضرور شادی کا چکر ہے وہ شادی کروانے کے لیے ایسے رہتی ہے، ان کی ماں باپ نے اس کی علاج بھی کروایا، دم دُعا بھی کیا، پَر کبھی ٹھیک ہوتی اور کبھی پھر بیمار ہو جاتی، کبھی کبھی باتیں بھی کرتی تھی، لوگ اس کی باتوں پر انجوائے بھی کرتے تھیاس طرح کچھ عرصے گزر گیا بعد میں یہ سب لڑکیوں کے ساتھ ہونے لگے اور شروع سکول سے ہوا، ایک دن اچانک بیٹھے بیٹھے ایک لڑکی کلاس میں چیخنے لگی اور ساتھ رونا بھی شروع کیا، سارے ٹیچرز سٹوڈنٹس اکھٹے ہو گیا اور لڑکی کو پکڑ لیا کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہے تھے کہ، ہوا کیا ہے،، بحر حال لڑکی کو ان کے گھر پہنچا دیا۔

اگلے دن کلاس کے دوران پھر کسی لڑکی کی چیخنے چلانے کی آواز آنے لگے، سب جمع ہو گیا کیا دیکھتا ہے کل کی طرح آج بھی ایک اور لڑکی چیخنے رہی ہیں، ساتھ میں سب اس کو سنبھالنے میں لگے ہیں، اس کو بھی گھر پہنچا دیا، اب تو روانہ سکول میں ایک یا دو لڑکی کے ساتھ گورمنٹ اور پرائیوٹ سکول دونوں میں ایسا ہونے لگا، گاؤں میں تشویش کی لہر دوڑ گئی کہ یا اللہ! ایسا کیا ہے سکول میں، جو یہ ہو رہا ہے اور وہ بھی صرف لڑکیوں کے ساتھ لڑکے محفوظ تھے، بیمار لڑکی کے

والدین ان کو کسی بزرگ کے پاس لے گیا تو انہوں نے کہا، ان پر پری کا سایہ ہو گیا ہے۔ پھر سکول سے نکل کے عام لڑکیاں بھی اس کا شکار ہونے لگا، جب لوگ ان سے اپنے بارے میں پوچھتا یا بتانے کو کہتا تو ایسی ایسی باتیں بتاتے کہ ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے سب باتیں اس لڑکی کی زبانی سنیے جو ہمہ وقت ان کے ساتھ ساتھ ان کی تیمارداری میں شامل رہی ہے، فاطمہ جو سب سے زیادہ شکار ہوئی تھی پریوں کا وہ شام کے ٹائم کہیں کام سے آ رہی تھی راستے میں اس کی طبیعت عجیب سی ہونے لگی اور گھر پہنچتے پہنچتے وہ بے ہوش ہو گئی تھی، گھر والے ہکا بکا یہ گھر سے ٹھیک گیا تھا اب کیا ہو گیا ہے، اس کو ہوش میں لایا گیا پھر اس سے پوچھا کیا ہوا ہے تو اس نے اپنی ساس کو بتایا تمہاری بیٹی اس گھر میں قرآن پاک کی بڑے بڑے سورتیں تلاوت کرتی تھی اس وجہ سے ہم ڈر کے تماری گھر نہیں آتی تھی، آج وہ گھر پہ نہیں ہے تو ہم نے تمہاری بہو کو ایسے جھگڑ لیا ہے اور بہت اذیت بھی دیں گے، سب اس کی حالتدیکھ کر پریشان تھے، کسی نے جا کے گاؤں کی مولوی کو بلا لایا انھوں نے کہا اس کو بھی پری آ گیا ہے، گاوں میں یہ مرض بڑھنے لگا اور سب کو پتہ بھی چلا ان میں پریاں آ گئی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے 51 / 16 لڑکیاں پریوں کا شکار ہو گئے، سب میں الگ الگ سے اثر انداز ہوتی تھی، دُعا کے لیے چند بزرگوں کو بلوایا گیا، انہوں نے آ کے کہا سکول کے گراونڈ میں پریاں ہے اور لڑکیاں بھی کہتی تھی، جب بچے گراونڈ میں جاتے تو کہتے یہاں ہم نے آلو کاشت کیا ہے تم لوگ ہماری آلوؤں کو نقصان مت پہنچاؤ اور گراونڈ میں مت آو، بچوں کے ساتھ سکول کی ایک مس کو بھی ہو گیا، وہ کہتی تھی پریاں گھر کے باہر سے مجھے سونے کی انگوٹھی دیکھا کے کہتی ہے تم اس کو لینے باہر آ جاؤ جب میں باہر نہیں جاتی ہے تو وہ ڈنڈا لے کے میری ہاتھ پاؤں پر مارنے لگتے ہیں اور ان کے باہر بلانے کا مقصد ان کو باہر لا کے یا تو دریا کی طرف لے جانا تھا یا کسی پہاڑ پر لے جانا تھا اور جن جن کو پریاں آئی تھی ان کے گھر والے رشتہ دار سب سختی سے ان کیحفاظت کرتے ان کی ساتھ ساتھ رہتے واش روم تک ساتھ جاتے تھے، ایک بار پانچ لڑکیوں کو ایک ساتھ ایک مولوی کے پاس لے گیا ان میں سے زاہدہ کو میں پکڑی ہوئی تھی اور مولوی سورۃ جن پڑھ کے دم کر رہا تھا زاہدہ کی آنکھیں بن تھی وہ ہنسنے لگی تو میں نے پوچھا تم کیوں ہنس رہی ہو تو

کہنے لگی مولوی نے سورۃ جن کی آخری آیات غلط پڑھا ہے، چار پانچ میری رشتہ دار تھی وہ سب اکھٹے رہتے اور ہماری گھر آجاتے اس رات مولوی صاحب نے دُعا کر کے دائرہ کھینچا تو اس پر فاطمہ اس کوٹو کنے لگی مولوی سے اردو میں بات کرواسے I am jamming شاہانہ کہنے لگی۔ ''مولوی صاحب انگلش نہیں آتی'' اور وہ کہی رہی تھی۔''میں آکسفورڈ یونیورسٹی میں پڑھ رہی ہوں۔''

ایک باران کو ہم کسی بزرگ کے پاس لے جا رہے تھے، ایک ٹیوٹا گاڑی میں، راستے میں ایک بڑے بزرگ کا آستانہ بھی آتا تھا اور جب سے یہ بیماری آئی تھی وہ سب لڑکیاں ڈوپٹہ بہت اچھی طرح پہن لیتے تھے، جب ہم ان بزرگ کے شہر میں انٹر ہی ہوا تھا، تو وہ ایک دوسرے سے کہنے لگی بزرگ کو ہماری زبان میں بوا کہتے ہیں، تو سب دوپٹہ اچھی طرح پہن لو بوا دربار میں بیٹھا ہوا ہے، جب بزرگ کے دروازے پر اتارا تو وہ چاروں بھاگنے لگی اور کہتی ہم اندر نہیں جائیں گی بوا دربار میں ہے جیسے تیسے ان کو اندر لایا گیا، کچھ دیر کے بعد بوا زنان خانے میں تشریف لایا تو فاطمیہ اٹھ گئی اور ہاتھ کو ماتھے تک لے جا کے بوا کو سلام کیا ساتھ کہنے لگی بوا بوا محمد آستانے میں آٹھ کے دُعا کر رہا ہے، مطلب راستے میں جس بزرگ کا آستانہ تھا اس بزرگ کے بارے کہہ رہی تھی، تو بوا قاسم جو خود بھی روحانیت میں بہت بڑے بزرگ تھا مسکراتے رہیں پھر بوا نے سب کو دم دُعا کیا، جب ہم واپس آنے لگے تو گاؤں کے مولوی جو ہمارے ساتھ تھا وہ گاڑی کے فرنٹ سیٹ پر بیٹھنے لگا۔ اس پر زینب کہنے لگی۔ آتے ہوئے بھی آپ فرنٹ سیٹ پر آئے ہیں اور اب جاتے ہوئے بھی آپ پیچھے بیٹھ جائیں، آگے میں بیٹھوں گی۔ فاطمیہ اور زینب آگے بیٹھی، واپس آتے ہوئے گاڑی جب اسی آستانے کے پاس پہنچی تو فاطمیہ زینب سے کہنے لگی بات مت کرو چپ رہو بوا محمد ناراض ہوگا، اس بزرگ نے گاؤں والوں سے کہا کہ سکول میں دُعا اور قرآن خوانی کریں، گاؤں کے بچے بوڑھے جوان مرد عورت سب نے مل کے سکول میں قرآن خوانی کیا سکول کی گراؤنڈ میں دُعا کیا اور دم کیا ہوا پانی بھی چھڑکا گیا صدقہ خیرات دیا، پریاں گئی نہیں تھیں، ایک دن ایک لڑکا آیا ہمارے گھر، وہ دروازے پر ہی پہنچا تھا۔ اس کو دیکھ کے شاہانہ کہنے لگی

رمضان میں تم نے دو روزے چھوڑے ہیں۔تم نماز کم پڑھتے ہو تو وہ لڑکا کہنے لگا، ہوں! مجھے ادھر نہیں آنا چاہیے تھا شرمندہ کر دیا، ایک بار ساری لڑکیوں کو ایک کمرے میں اکھٹا کیا تھا دُعا کے لیے کیونکہ تین چار بزرگوں کو بلایا تھا۔ بزرگ لوگ دُعا کر رہے تھے اور ایک بزرگ فاطمیہ کو دُعا کرتے اور لکڑی کو کاٹتے جاتے تھے پھر دُعا ختم کر کے وہ لوگ چلے گئے، کچھ دن بعد فاطمہ کی گھر میں گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا، جس لڑکی بھی کو پری آئی ہوئی ہوتی تھی وہ لوگ کوئی صدمہ برداشت نہیں کر پاتے تھے اس دن فاطمیہ زیادہ بیمار ہوئے وہ بھاگنے کی کوشش کر رہی تھی اور چار پانچ مرد نے اس کو پکڑ رکھا تھا۔ وہ ان مردوں کو بھی اٹھا رہی تھی ان کے اندر کی پری اتنے طاقتور تھے، ہم ان کو ایک دوسرے گاؤں میں لے گیا وہاں ایک بزرگ رہتا تھا رات کا ٹائم تھا جب ہم ان کے گاؤں پہنچا تو وہاں سیر رونے کی آواز آرہے تھے، شاید وہاں کوئی فوتگی ہوا تھا فاطمیہ بھی سن کے کہنے لگی دیکھو اپنے لوگ فوت ہو تو تم لوگ روتے ہو جب کہ میرا ٹانگ ٹوٹا ہے میں کچھ نہیں کر رہی، اصل میں بوا نے جو لکڑی دُعا کر کے ٹوٹا تھا، وہ پری کی پاؤں تھی، اسی کا رولا وہ ڈالی ہوئی تھی بحر حال بزرگ مل گیا اور اس نے دُعا کر کے دم کیا پھر پوچھا اب دیکھو پاؤں ٹھیک ہوا ہے۔نہیں وہ اٹھ کے چلنے پھرنے لگی پھر خوش ہو کے کہا ہاں ٹھیک ہو گیا ہے پھر ہم راتوں رات واپس آگیا۔اب خدا خدا کر کے حالات تھوڑا نارمل ہونے لگی تھیں لیکن مکمل نہیں ایک رات میں ماموں کے گھر رہنے گئی ان کی بیٹی بانو کو بھی پری آئی ہوئی تھی رات کو سب اس کے پاس سوتی تھی کہیں وہ بھاگ نہ جائیں، اس رات بھی ہم جاگ رہے تھے کہ وہ ان سے باتیں کرنے لگے وہ لوگ اس کو لینے آرہی تھی تو بانو ان کو راستہ سمجھانے لگی سمجھاتے سمجھاتے وہ کہہ رہی تھی میرا دروازہ بن ہے کھڑکی بھی بن ہے۔میں چھت کے روشندان سے آؤں گی پھر چھت سے نیچے چھلانگ لگا کے آؤں گی یہ سب بتا کے وہ ایک دم بستر سے اٹھ کے بھاگنے لگی ساتھ میں ہم سب بھی اٹھ گئے اور اسے پکڑ لیا گاؤں میں عجیب سا سماں ہو گیا تھا اور لوگ اپنے گھر کے بارے میں تعلیم کے بارے میں ان سے معلومات بھی لیتا، اگلے دن میں بانو کے ساتھ گلی سے گزر رہی تھی تو دیکھا ادھر گاؤں کا ہی ایک آدمی موسی جا رہا تھا بانو ان پر تھوکتے ہوئے کہنے لگی۔اس نے ہمارا گھر اجاڑا ہے یعنی

پریوں کی، اس بات کی تحقیق کیا تو پتہ چلا بہت پہلے پریاں آزاد پھرتے تھے پھر ہمارے ایک، بزرگ نے دُعا کے ذریعے ان کو ایک بہت بڑے پتھر میں کیل ٹھونک کے بن کیا گیا تھی یہ شخص موسی مزدوری کرتا تھا کسی نے اس کے ذریعے اس پتھر کو توڑا یوں اس پتھر کے ٹوٹنے سے پریاں آزاد ہوگئی تھی mashen اس کے پاس اور اس گاؤں کی لڑکیوں سے ٹکرا گئی اور اس پاس کے گاؤں والوں نے ہمارے گاؤں کو پریستان کا نام دیا،لوگ ہمارے گاؤں میں آتے ہوئے بھی ڈرتے تھے۔فاطمہ جو سب سے زیادہ متاثر ہوئی تھی ایک بار انہوں نے رات فاطمیہ کو لے گیا وہ کہتی ہے ڈر کے وہ درود شریف کی ورد کر رہی تھی وہ اس کو اپنے علاقے میں لے گئے تھے جب وہاں پہنچی تو اس نے دیکھا ایک جگہ لوگوں کا ہجوم تھا،اس نے ان سے پوچھا یہ لوگ یہاں کیا کر رہا ہے تو انہوں نے بتایا جس طرح ہم تم لوگ میں آتے ہیں،اسی طرح تم انسان بھی ہم میں آتے ہیں جو ادھر بیٹھا ہوا ہے وہ ہمارا بزرگ ہے باقی لوگ دُعا کے لیے آیا ہوا ہے۔فاطمیہ کہتی ہے۔پھر دوبارہ لا کے گھر چھوڑ گیا۔بیماری کی شدت تھوڑا کم ہو گیا تھا لیکن مکمل ختم نہیں ہوا تھا،تو کبھی فاطمیہ کہتی تھی میں عالم برزخ میں جاتی ہوں ایک بار وہ کہنے لگی۔پریاں ہمارے ہمسائے کے گھر کیسا منے ہے تو امی نے اس سے کہا تم ان سے کہو ان کے گھر جائیں،لیکن فاطمیہ نے بتائی وہ کہتے ہیں۔ہم کیوں جائیں۔ہمیں اللہ جن میں جانے کا حکم دیتا ہے ان میں ہی جاتی ہوں، ایک دن ہم بیٹھے ہوئے تھے فاطمیہ نے کہنے لگی آج ساری پریوں نے سفید لباس پہنا ہوا ہے اور کہتا ہے،ان کا کوئی بزرگ آرہا ہے تو ان کے استقبال کی تیاریاں ہیں۔جن جن کو بھی پریاں آئی تھی ان کی ایک اچھی بات گالی گلوج نہیں کرتی تھی نہ کسی سے جھگڑا کرتی تھی بس بھاگنے کیکوشش میں رہتی تھی اور اچھی باتیں بھی بتاتی ،نماز پڑھا کرو، روزہ رکھو، حج کرو تو گاؤں کے ایک آدمی کا نام لے کے کہتا۔اس جیسا حج کرو، دُعا کرنے والوں سے کہتے ،دیکھنا تم لوگ ابھی باوضو ہو کبھی بغیر وضو کے ملو تو کیا کرتی ہوں خدا خدا کر کے دم دُعاؤں کے ذریعے آہستہ آہستہ بیماری ختم ہوتے گئی اور گاؤں میں حالات نارمل ہو گیا سب ٹھیک ہو گیا بس کبھی کبھی اب بھی یہ بیماری کسی میں اپنا جھلک دیکھاتی ہے جو بات قصے کہانیوں کا حصہ تھا وہ ہماری زندگی میں ہماری مشاہدے

میں بھی آ گیا جس طرح انسان کی رہن سہن ہے جو ضروریات ہے بالکل اسی طرح جن اور پریاں بھی زندگی گزرتے ہیں۔

❖❖❖❖❖

سفرنامہ

بلتستان میں خزاں کے ساتھ سردی اپنی پوری آب و تاب سے جلوہ گر تھی۔کبھی کبھار پہاڑوں پر برف بھی پڑنے لگتی تھی۔ابھی زمین پر برف باری شروع نہیں ہوئی تھی۔لیکن دھند پڑ رہی تھی اور انگیٹھیوں میں آگ کچھ دیر کے لیے بھی بند نہیں کی جاتی تھی خون جما دینے والے سردی میں بھی لوگ اپنے اپنے روزمرہ کے کاموں کو انجام دیتے رہتے تھے۔اس ٹھٹھرتی سردی میں ہمیں جوٹا سک ملا وہ مشکل تھا۔

ہم نے ان سردی کے مہینوں میں 50 میڈیکل کیمپ کرنے تھے،اسی سلسلے میں آج ایک دُور افتادہ گاؤں میں آئی ہوئی تھی، پانی پر برف جما ہوا تھا۔جگہ جگہ روڈ میں بھی برف جمی ہوئی تھا،لیکن اللہ پر توکل تھا اور ڈرائیور بھی ماہر تھا اس لیے زیادہ فکر کی بات نہیں تھی،سو جیسے ہی ہم اس گاؤں میں پہنچی دھند اور تند و تیز ہوا نے ہمارا استقبال کیا۔دھند شہر میں بھی تھی۔لیکن یہاں کچھ زیادہ تھی۔جو بھی ہو ہم نے اپنا فرض نبھانا تھا،اس لیے اپنے کام میں جت گئی۔مریضوں میں گم ہو کر سردی کا احساس بھی تھوڑا کم ہو گیا۔آگے گاؤں والوں نے بھی ہیٹنگ کا انتظام کر رکھا۔

میں اس کا خاص اثر بھی نہیں ہو رہا تھا،اس کے باوجود میں نے اپنا فرض ادا کیا۔room، تھا لیکن اتنے بڑے اور کھلیا ور شام کو واپس آگئی۔پھر راستے میں اگلے دن کا پروگرام طے کیا۔اگلے صبح 7 بجے ہم روانہ ہوئے جس گاؤں میں ہم جارہے تھے،وہاں کے آدھا راستے تک ہماری گاڑی جا سکتی تھی۔آگے کے لیے گاؤں والوں نے اپنی ایک ویگن تیار کر رکھی تھی اور راستہ اتنا تنگ اور خراب تھا کہ ایک وقت میں ایک ہی گاڑی گزار سکتی تھی اور اگر دوسری گاڑی آجاتی تو 15 / 20 منٹ ضائع ہو جاتے تھے۔اللہ اللہ کر کے ہم گاؤں پہنچ گئے۔یہاں پر سردی کے باوجود کچھ اور ہی عالم تھا۔300 مریضوں، کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ایک تو لوگ بھی ناں جہاں مفت میں کچھ ملے اندھا دھند آجاتے ہیں خواہ۔ضرورت ہو نہ ہوا نہیں دیکھتے دیکھتے

شام ہوگئی۔ جب واپس آ رہے تھے۔ تو ایک ڈراما ہوگیا۔ ہمارے ساتھ ہمارا افسر بھی تھا۔ وہ فرنٹسیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ ابھی تھوڑی دور ہی گئے تھے کہ فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھل گیا اور افسر گرتے گرتے بچا، پیچھے سے ایک ڈاکٹر صاحبہ نے ہاتھ بڑھا کر اسے پکڑ لیا، تو سب کی سانسیں بحال ہوئیں، گھر پہنچتے پہنچتے رات کے 7 بج گئے تھے۔ کیونکہ گاؤں بہت دور تھا گھر پہنچی تو گھر والے بھی خاصے پریشان تھے۔ رابطہ نہ ہونے کی وجہ سے۔ اگلے روز، پھر صبح کا سوچتے سوچتے سوگئی، صبح پھر جانا تھا۔ جب صبح ہوئی تو دیکھا ہلکی پھلکی برف پڑ رہی تھی۔ سوچا، آفس کال کروں اس موسم میں جانا ہے یا نہیں لیکن آفس والوں نے کہا راستہ اتنا خراب نہیں ہوا کہ کام روکا جائے اس لیے آپ لوگوں کو جانا پڑے گا۔ سو صبح ناشتہ وغیرہ کر کے پھر نکل پڑی۔ آج جس گاؤں میں جانا تھا۔ وہاں چڑھائی تھی۔ جب ہم گاؤں میں انٹر ہوئے تو پتہ چلا کہ گاؤں میں برف کچھ زیادہ ہی پڑی ہوئی ہے۔ آگے گاڑی نہیں جاسکتی۔ ہم سب چارو ناچار ٹھٹھرتی ہوئے گاڑی سے نکلے اور پیدل چلنا شروع کیا۔ 10 / 15 منٹ کا راستہ طے کر کے گاؤں پہنچ گئے۔ یہاں ہیٹنگ کا نظام بھی کچھ خاص نہیں تھا۔ لیکن پھر وہی مسئلہ ہم نے اپنا کام کرنا تھا فرض نبھانا تھا جیسے تیسے مریضوں سے فراغت ہوئی اور شام کو گھر کی راہ لی، راستے میں پھر اگلے دن کا پلان بنایا اور گھر آ گئی گھر پہنچی تو جسم تھکن اور سردی کی وجہ سے اکڑ سا گیا تھا۔ رات کا کھانا کھا کے نماز وغیرہ پڑھ کے ایک گولی کھا کے سوگئی۔ کیونکہ صبح پھر جانا تھا۔ صبح صبح اٹھ گئی۔ آج جہاں جانا تھا وہ ان سب سے بہت دُور تھا۔ اس لیے ذرا جلدی روانہ ہوئے ہم اور جاتے ہوئے دیکھا راستہ بہت تنگ تھا ساتھ ساتھ دریا، دریا تو یہاں پر کہیں بھی جائے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ مگر جس چیز سے تھوڑا خوف محسوس ہو رہا تھ وہ تنگ روڈ تھا پھر بھی خیر سے منزل پر پہنچ گئے۔ وہاں پر بھی مریضوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی کیونکہ گاؤں میں یہ رواج ہے کہ کوئی بھی اجتماعی کام ہو یا کوئی میڈیکل کیمپ لگانا ہو تو سپیکر میں اعلان کرتے ہیں۔ آج یہاں میڈیکل کیمپ کا انتظام کیا گیا تھا اس کا اعلان بھی ہو چکا تھا اس لیے اس میں مریضوں کا مفت علاج کیا جاتا ہے آپ لوگ تشریف لائیں، پھر جوق در جوق لوگ آنے لگے ہمارے پہنچنے سے پہلے لوگ پہنچے ہوئے

تھے۔آتے ہی ہم نے اپنا کام شروع کیا اور 3 / 4 بجے تک فارغ ہو کر ہم نے پھر واپسی کی رہ لی۔اتنی تھکن کے باوجود راستے میں ہلکا پھلکا مذاق بھی چلتا رہا،اس وجہ سے راستہ بھی آسانی سے کٹ گیا اور ہم گھر پہنچے۔اگلی صبح پھر سفر کی تیاری کر کے نکل پڑے۔آج ہم نے ایک نزدیکی گاؤں ہی جانا تھا اس لیے صبح دیر سے نکلے، وہاں پہنچے جو جگہ کو انہوں نے منتخب کی ہوئی تھی۔ادھر ہم نے کام شروع کر دیا گاؤں والوں نے کھانے کا انتظام بھی کر رکھا تھا۔مریضوں کو فارغ کر کے کھانا کھا کے ہم نکل آئے کام کے ساتھ ساتھ اوٹنگ بھی ہوتی رہی گاؤں گاؤں قریہ قریہ بھی دیکھنے کو ملا وہ بھی ٹھٹھرتی سردی میں اپنے فرض کے ساتھ اللہ ان سب کو جزا بھی عطا فرمائے۔آمین

❖❖❖❖❖

وہ چراغ بجھ گیا

میرا جزبہ اتنا کمزور تو نہیں تھا یا میرے دل میں کوئی منافقت تھا۔ جو تم کو مجھ سے دُور لے گئی، میں نے تو اپنے دل کی تمام تر سچائیوں سے تم کو چاہا تھا اور دُعاؤں میں مانگا تھا۔ تو میرا ہم سفر بنے، ذیشان دکھی دل کے ساتھ یہ سب کچھ بتا رہے تھے اور میرے آنسو میرا گریبان بھگو رہے تھے۔ میں نے کب کہا۔ تم نے مجھے دھوکا دیا ہے۔ یا تم سچے نہیں ہے۔ پھر یہ سب کیا ہے۔ تم نے کسی اور کی نام کے انگھوٹھی کیوں پہنی ہے۔ تم نے ہاں کیسے کی ہیں؟

میں اور ذیشان ایک دوسرے سے پیار کرتے تھے۔ سکول میں آتے جاتے ایک دوسرے کو دیکھ لیتے، یا کبھی کبھار باتیں بھی ہو جاتا، میں ایک امیر گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں اور ذیشان متوسط گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔ یہ اسکول کی زمانے کی بات ہے ہم دونوں نائن میں پڑھ رہے تھے۔ اسی دوران میرا رشتہ آ گیا۔ وہ بھی ہماری طرح امیر گھر کا اور ہمارا پارٹنر بھی تھا۔ سو ہمارے گھر والوں نے میری مانگنی کاظم سے کر دیا۔ یہ خبر جب ذیشان نے سنا، تو وہ بے ہوش ہو کے ہسپتال پہنچا، میں اس کو دیکھنے آئی، تو، وہ مجھے یہ سب شکوہ کرنے لگا۔ پر میں بھی مجبور تھی۔ کیا کرتی، ادھر ڈاکٹر نے ذیشان کے گھر والوں سے کہا تھا۔ اس کو کوئی دکھ نہ دے اس کی دل میں سوراخ ہوا ہے۔ ادھر اس کے گھر والے اسے بڑے شہر کے جانے کی تیاری کرنے لگے، ادھر میری شادی کی تیاری شروع ہو گیا۔ جس وقت میں دلہن بنتیا رہوئی ادھر ذیشان کو کا انتقال ہو گیا۔ جب میری سہیلی آ کے میری کان میں یہ بات کہی تو میں بے ہوش ہو گئی تھی۔ گھر والے سب حیران و پریشان کہ مجھے کیا ہوا ہے سب کی خیال آرائیاں کہ میں نے کچھ کھایا نہیں اور گھر سے بچھڑنے کا دکھ ان سب کی وجہ سے بے ہوش ہے۔ لیکن میں اور میری سہیلی جانتی تھی۔ میری دل کی دنیا لٹ چکی تھی۔ جب مجھے ہوش آیا تو مجھے رخصت کر دیا۔ میں دل پہ بہت بڑی بوجھ لیے پیا دیس سدھار گئیں۔ یہاں پر عالیشان استقبال اور دولہا کا والہانہ استقبال کچھ بھی مجھے

متاثر نہیں کر سکا۔اس طرح دن گزرتے گئے۔

پھر ایک دن کاظم مجھے سمجھانے بلکہ بتانے لگا۔تمہارے اس سلوک کی وجہ میں جانتا ہوں ہم دونوں میں سے کسی ایک کی جان تو جانی ہی تھی۔سو وہ چلی گئی ہے۔اب جو رہ گیا ہے اس زندگی کو بھی غم کے نذر نہ کرو، چلو آگے بڑھتے ہیں۔یہ کہہ کر اس نے میرا ہاتھ تھام لیا اور میں نے اپنے غم کو دل میں چھپا کر مسکرا کے اس شخص کی طرف دیکھا، جو کب سے میری واپسی کی رہ دیکھ رہا تھا اور میرا لوٹنے کا انتظار بھی۔

❖❖❖❖❖

بانجھ پن اور عورت

پاکستان !تم نے سنا، طارق نے اپنی بیوی کو طلاق دیدی ہے ماریہ نے راز داری سے حنا کو یہ بات بتائی۔

''کیا؟ نہیں۔ میں نے نہیں سنا۔'' حنا نے حیرت سے پوچھا، طارق نے صابرہ کو طلاق کیوں دی ہے؟ ان دونوں کی تو محبت کیشادی تھی۔ دونوں کے گھرانے راضی نہیں تھے۔ ان دونوں نے گھر چھوڑنے کی دھمکی دے کے گھر والوں کو منایا تھا۔ حنا بہت افسوس سے یہ سب کہہ گئی۔

''ہاں تمہاری سب باتیں صحیح ہیں۔لیکن زندگی صرف محبت کے سہارے تو نہیں گزار سکتے نا؟ پہلے محبت کرتا ہے، پھر ملنے کے لئے جان تک کی دھمکی دیتا ہے اور حاصل کرنے کے بعد زندگی گزارنے کے لئے باقی چیزوں کا خیال بعد میں آتا ہے۔اچھا! ابھی کس وجہ سے طلاق ہو گئی؟'' حنا نے پوچھا تو ماریہ کہنے لگی۔''اولاد کے لئے، وارث کے لئے۔ان کی شادی کو 5 سال کا عرصہ ہوا تھا۔لیکن ابھی تک اولاد کی نعمت سے محروم تھے اور طارق کے گھر والے چاہتے تھے کہ طارق صابرہ کو طلاق دے کر دوسری شادی کر لے۔''

''اچھا۔ ویسے طارق خود کیا چاہتا تھا؟''

''وہ بھی وارث چاہتا تھا اور دوسری شادی کرنے کے لئے صابرہ کو طلاق دی ہے۔لیکن صابرہ چاہتی تھی کہ طارق اس کو طلاق دیئے بغیر شادی کر لیں ،لیکن طارق نہیں مانا۔صابرہ نے طارق کو اپنی محبت اور رفاقت کا واسطہ دے کر منانے کیکوشش کی لیکن طارق وہ محبت قسمیں سب بھلا کے ناطہ توڑ دیا۔''

حنا افسردہ لہجے میں کہنے لگی:''آہ! عورت کی بھی کیا قسمت ہے۔اگر عورت بانجھ ہو تو مرد سب وعدے قسمیں بھلا کے سوکن لاتے ہیں۔یا طلاق دے کر جان چھڑوا لیتے ہیں۔اگر مرد

بانجھ پن کا شکار ہو تو عورت بے چاری اپنے حق میں ایک لفظ احتجاج کا بھی نہیں بول سکتی، بلکہ وہ سرے سے اس بات کو چھپانے کی کوشش میں لگی رہتی ہے اور خود کو قصوروار بنا لیتی ہیں تا کہ اپنے شوہر کی آبرو پر کوئی حرف نہ آئے، ساری زندگی اسی ادھورے پن میں وفا خلوص محبت و عقیدت کی مثال بن کر گزار دیتی ہیں۔ یہاں تک کہ اپنی ممتا کا گلہ بھی گھونٹ کر شوہر کی قدموں میں خود کو گرا دیتی ہے۔عورت اور مرد کی محبت میں یہی فرق ہے عورت خود کو ایک مرد کے لیے فنا کر دیتی ہے اور مرد پر تھوڑی سی آزمائش کیا آئے رشتہ ناطہ ہی توڑ دیتا ہے۔''

❖❖❖❖❖

موبائل فون

جب فون نام کا کوئی وجود نہیں تھا۔اس زمانے میں بھی وارداتیں ہوا کرتی تھیں۔لڑکیاں بھاگ کر شادی کر لیتی تھیں۔گھروں میں طلاق دینے کا رواج بھی تھا۔میاں, بیوی کے درمیان جھڑپیں بھی ہوتی تھیں۔لڑکے اورلڑکیاں ایک دوسرے کو پسند بھی کرتے تھے۔پھر دنیا ترقی کی راہ پر گامزن ہوگئی تو فون بھی آ گیا۔سب کو سہولیات میسر آ گئیں۔پہلے خط وکتابت کے ذریعے ایک دوسرے کی خیریت معلوم کرنے میں مہینوں لگتے تھے۔اب ایک ہیلو کی دوری پر ہی تھا۔ہر خاص وعام مردوعورت سب نے اس سے استفادہ اٹھانا شروع کر دیا۔موبائل کے فوائد کے ساتھ ساتھ اس کے نقصانات بھی زیادہ ہیں۔جہاں موبائل دور رہنے والے ماں باپ کو بچوں سے دوری کا احساس مٹاتا ہے۔بہن، بھائیوں، دوست، احباب کو ایک دوسرے سے دور نہیں ہونے دیتا۔وہاں لڑکے لڑکیوں کے آپس میں روابط کو بھی آسان بناتا ہے۔موبائل فون شادی شدہ لوگوں کو بھی توڑنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔چند دن پہلے میں گلی سے گزر رہی تھی۔تو دیکھا ایک جگہ کچھ خواتین بیٹھی ہوئیں تھیں۔ایک دوسرے کے کانوں میں کسر پھسر میں مصروف تھیں۔میں یہ سوچ کر آگے بڑھ گئی۔یہ تو عورتوں کی عادت ہے جہاں دو خواتین جمع ہو، کھسر پھسر شروع ہو جاتی ہے۔کچھ اور آگے چلی تو ادھر کچھ لڑکیاں بھی یہی کر رہی تھیں۔اس پر میں ٹھٹھک گئی۔یہ معمول سے ہٹ کر تھی۔پتہ نہیں کیا واقعہ ہوگیا ہے؟ یہی سوچتے ہوئے میں ان کے پاس رکی اور ایک لڑکی سے پوچھا۔بانو کیا ہوا ہے؟ جگہ جگہ پر عورتیں کھسر پھسر میں کیوں مصروف ہے؟ آپ کو نہیں معلوم! کہ کیا ہوا ہے؟ یہی کہ اسلم کی بیٹی بھاگ گئی ہے۔کیا؟ وہ ممتاز؟ میں نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔جی وہی، وہ تو شادی شدہ ہے۔وہ کیسے بھاگ گئی۔کیوں باجی کیا شادی شدہ نہیں بھاگ سکتیں؟ اب موبائل فون کا دور ہے۔موبائل فون نے شادی شدہ اور غیر شادی شدہ کا فرق مٹا دیا ہے۔شادی شدہ بھی موبائل فون پر بات کرتے

ہیں۔گھر، ماں کی ممتا، شوہر کا خلوص، سب بھول جاتے ہیں۔بس یاد رہتا ہے تو صنف مخالف کی باتوں کی کشش، اچھا، کب کس کیساتھ بانو؟ میں نے بانو سے پوچھا۔یہ تین دن پہلے کی بات ہے۔کس کے ساتھ گئی یہ تو، پتہ نہیں۔کہاں کا رہنے والا ہے کچھ معلوم نہیں۔بوڑھا تھا یا جوان کچھ خبر نہیں اور اس کے شوہر اور ماں، باپ کا کیا حال ہے؟ ماں دو دن سے بے، ہوش ہے۔یہ سنا ہے بانو نے مجھے بتایا۔شوہر بھی بستر پر پڑا ہے۔بس اللہ خیر فرمائے۔آمین۔بہت برا کیا اس نے اپنے ماں باپ، شوہر بچوں، کے ساتھ ساتھ، بلکہ گاؤں اور لڑکیوں کے نام تک کو بھی بدنام کر کے بہت برا کیا۔لڑکیوں کو دیکھ، بھال کر چلنا چاہیے۔سب کچھ یوں داؤ پر نہیں لگانا چاہیے۔دنیا کے ساتھ ساتھ آخرت بھی برباد کر دیتی ہیں یہ لڑکیاں اللہ تعالیٰ تمام شادی شدہ اور غیر شادی شدہ، لڑکیوں کے ساتھ مردوں کو بھی نیک ہدایت دے۔آمین

❖❖❖❖❖

باپ

مریم کیا کر رہی ہو۔

جی باجی میں یہ کاغذ کی جہاز بنا رہی ہوں۔آیئے آپ بھی بیٹھئے ناں،ادھر دیکھو یہ خوبصورت بنا ہے ناں۔باجی۔لیکن میں مریم کی جہاز کو نہیں دیکھ رہی تھی۔میں تخیل میں بابا کو دیکھ رہی تھی۔وہ جھلستے دھوپ اور برستے بارش کی پروا کئے بغیر ہمارے لیے کتنے محنت کر رہے تھے اور یہاں مریم پائی پائی جامع کئے ہوئے پیسے کو جہاز بنا کے خوش ہو رہی تھی۔میں نے دل میں کہا اوہو میرے پیارے بابا جانی آپ ہمارے لیے کتنے تکلیف برداشت کرتے ہیں اور ہمیں احساس بھی نہیں،نہ دھوپ میں آپ کی جھلسنے کا نہ ہاتھوں کی چھالوں کا،ہم بس سب کچھ حق سمجھ کیوصول کرتے ہیں۔تبھی مریم نے مجھے زور سے آواز دی۔

ارے باجی کہاں گھوم ہو،ادھر دیکھو میں نے کتنی جہاز بنایا ہے۔مریم تم ان کاغذ کو کیوں ضائع کر رہی ہے۔اف باجی ضائع کہاں کر رہی ہوں۔میں تو سب کے لیے جہاز بنا رہی ہوں۔آپ کے لیے بھی بنائی ہے۔

میں مریم کے پاس بیٹھ گئی اور نرمی سے بولی،مریم اس طرح کاغذ کو ضائع نہیں کرنا چاہیے ہے۔باجی کیا میریکھیلنے پر آپ کو اعتراض ہے؟

نہیں میری گڑیا مجھے اعتراض آپ کی کھیلنے پر نہیں،پھر؟ اعتراض کاغذ کو ضائع کرنے پر ہے۔اچھا وہ کیوں؟ آپ کو پتہ ہے۔بابا کب گھر سے نکلا ہے۔باجی پتہ ہے بابا ہمیشہ میری اٹھنے سے پہلے کام پر چلا جاتا ہے اور پھر دیر سے آتے ہیں۔

بابا کو ایسا نہیں کرنا چاہیے ہے نا کبھی ہمارے ساتھ بھی بیٹھ کے ناشتہ کرنا چاہیے ہے۔ہاں میں بھی تم کو یہ سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں۔بابا اتنے صبح کام پر جاتے ہیں اور شام کو آتے ہیں۔

وہ ہمارے لیے پیسے کمار ہے ہیں تا کہ ہم بھوکے نہ رہے ہم تعلیم حاصل کر سکے۔ ہم کہیں تن ڈھانپنے کو کسی کی محتاج نہ رہے۔ بابا ہمارے لیے دھوپ میں سایہ ہے بابا وہ سایہ دار درخت ہے۔

جس کی چھاؤں میں ہم جس طرح چاہے رہ سکتا ہے۔ کوئی ہمیں کچھ کہنے کی جرات نہیں کرتے۔ ہمارے لیے تو وہ دن رات ایک کرتا ہے اس لیے ہمیں بھی چاہے ہے۔ کہ ہم بھی ان کی تھوڑا مدد کریں۔ باجی ہم تو کوئی کام بھی نہیں کر سکتی۔ نہ مزدوری کر سکتیں ہیں۔ پھر بابا کی مدد کیسے کریں گے؟

امی ہم دونوں کی گفتگو سن رہی تھی۔ مسکراتے ہوئے ہمارے پاس بیٹھ گئی اور بولی آپ اپنے بابا کی مدد باکل کر سکتی ہیں۔ کیسے؟ ابھی آپ کاپی پھاڑ کے جو جہاز بنا رہی ہے ایسا کر کے آپ پیسہ ضائع کر رہی ہے ایسا نہ کریں۔

آپ ہر روز سکول میں پنسل شپنر چھوڑ کے آتی ہے پھر روزانہ نیا لینا پڑتا ہے۔ آپ چیزوں کو سنبھل کے رکھیں تو یہ بھی آپ کے بابا کی مدد ہے۔

فضول چیزیں نہ لیں، ہر چیز میں میانہ روی اختیار کریں۔ تو یہ بھی مدد ہے وہ صبح شام محنت کریں اور ہم اڑاتے رہیں تو یہ ان پر ظلم ہوا نا، ہم دونوں نے امی کی طرف دیکھا تو امی بولی، سمجھ گئے؟ اپ دونوں میری بات؟ جی امی آئندہ ہمیں ایسا کوئی کام نہیں کروں گی جس سے بابا کی محنت ضائع ہو، ان شاء اللہ دیکھنا میں بہت پڑوں گی اور ڈاکٹر بن کے بابا کو حج کراؤں گا۔

رائیگاں نہیں ہونے دوں گی تینوں نے یک زبان ہو کر بولا۔ ان شاء اللہ

❖❖❖❖❖

بے قرار ممتا

السلام علیکم!

وعلیکم السلام! کیسی ہے اور آپ کون ہیں؟ میں ہسپتال کی آیا ہوں، اچھا کب سے چار پانچ مہینہ ہوئے ہیں۔ٹھیک میں جب ایک لمبی چھٹی کاٹ کے ڈیوٹی پر آئی تو میری ملاقات ہسپتال کی نئی آیا سے ہوئی۔ وہ ایک جوان اور ایکٹولڑکی تھی میں کبھی کبھار فارغ ٹائم میں اس کے پاس کچن میں جاتی تھی۔تو اس نے باتوں باتوں میں اپنی جاب کرنے کی وجہ کچھ یوں بتائی۔۔۔

میری والدین نے بہت چاہ سے میری شادی میرے ہی گاؤں کے ایک لڑکے یوسف سے کردی میں نے بھی والدین کی حکم آمین کہہ دیا، یوسف اپنے والدین کی اکلوتے بیٹے تھے۔

اور وہ لوگ جلد شادی کرنا چاہتے تھے۔لیکن میں ایک دو سال مزید ماں باپ کے ساتھ رہنا چاہتی تھی۔لیکن ان کے اصرار پر شادی کا فیصلہ کیا۔اور میں دلہن بن کر یوسف کے گھر آ گئی، یوسف بہت اچھا انسان اور شوہر تھا ان کے والدین بھی بہت اچھے تھے۔۔۔

گھر کی اکلوتی بہو کو بیٹی کی طرح چاہتے تھے اور بیٹی کی طرح رکھتے تھے۔ یہاں آکر جو میں شادی نہ کرنے کی ضد لگا رکھی تھی۔اس پر مجھے ہنسی آنے لگی، بہت اچھا گھرانا ملنے پر میں اللہ کا شکرادا کرتی، گھر میں کسی قسم کی کوئی تنگی نہیں تھی۔۔۔

یوسف فوج میں ہونے کے ساتھ زمین بھی تھا گھر میں دو تین گائیں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ جس طرح چاہو دودھ اور مکھن استعمال کرو، کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔۔۔

جب میں پریگنٹ ہوئی تو گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ کیونکہ یوسف اکلوتا تھا گھر والے بچوں کو ترسے ہوئے تھے۔اس لیے ساس سسر میرا بہت خیال رکھتے، میں بھی اپنی قسمت پر نازاں تھی۔ میرا پہلی بیٹی ہوئی سسرال کیساتھ میرے ماں باپ بھی بہت خوش ہوئے، ہمارے گاؤں کے رواج کے مطابق جب بیٹی پیدا ہوتی ہے تو ماں باپ کے گھر سے ایک لاکھ روپے

ساتھ میں 10 / 15 کلومکھن لے آتے ہیں اگر پیسے کم ہوں تو ایک گائے دیتے ہیں جس کی (جس کی قیمت آج کل ڈیڑھ لاکھ ایک لاکھ میں ہے) یوسف بھی بے تحاشا خوش تھا وہ مجھے سے بہت محبت کرتا تھا۔۔اس کی محبت کو پا کر میں بھی تھوڑا مغرور رہتی تھی۔زندگی خوشی خوشی گزر رہی تھی۔11 سالوں کی رفاقتمیں ہمارے چار بچے ہو گئے تھے،میری مغروری شاید اللہ کو پسند نہیں آئی،اس بار یوسف دو ماہ کی چھٹی پر آیا تھا کیونکہ گھر کے کچھ کام بھی تھے۔

کچھ دن بعد کی بات تھی ان کا رویہ مجھے کچھ بدلا بدلا لگا،میں اس پر غور ہی کر رہی تھی کہ رات کو وہ کسی رشتہ دار کے ہاں دعوت کو گئے تھے۔ٹائم کافی ہونے کے بعد بھی وہ نہیں آیا لیکن میری تائی آ گئی،وہ مجھے بستر سیا ٹھا کے کھینچتے ہوئے لے گئی اور تمہیں کچھ دکھاتی ہے۔تائی رات کے اس ٹائم لیکن میری بات میری زبان میں ہی رہ گئی ساتھ والے گھر میں یوسف اور میری ہمسائی ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔۔۔

اس کا دیکھنا تھا کہ میں ٹھر ٹھر کانپنے لگی،دکھ صدمہ بے اعتباری دھوکا محبت کا قاتل کیا کچھ اس لمحے میں مٹی کا ڈھیر ہو گئی تھی۔

میں آگے جانے کے بجائے بے جان قدموں سے واپس آ گئی،اس رات میں گونگی ہو گئی تھی۔چپ ہی رہی اگلے دن سے میرا اور یوسف کا جھگڑا رہنے لگا۔میں نے کہا آپ نے اچھا نہیں کیا میرے ساتھ تو،وہ کہنے لگے میں حبیبہ زبردستی مجھے گھر لے گئی تھی۔میں جانا نہیں چاہتا تھا۔قسم خدا کی،پر میں اعتبار کرنے کو تیار نہیں تھی۔۔۔

میں نے کہا آپ اس سے شادی کر لیں وہ تین یتیم بچوں کی ماں تھی۔وہ اپنے گھر میں رہے گی میں اپنی گھر میں،لیکن کچھ دن بعد جب میں حاملہ بھی تھی یوسف نے روتے ہوئے مجھے طلاق دے دی یہ کہتے جب تجھے سامنے دیکھتا ہوں تو بہت غصہ آتا ہے اور میرا دل تجھے رکھنے کو نہیں مانتا،یوں 11 سالوں کی محبت بھری رفاقت کو ایک اور عورت نے لمحوں میں مٹی کر دیا،اس پر ایک اور ظلم یہ کیا وہ بچوں کو اور نئی بیوی کو لے کر شہر چلا گیا۔۔۔

اور میری ممتا تڑپتے بلکنے لگی،پھر میں شہر آنے لگی تو میرے گھر والے منع کرنے لگے،لیکن

ممتا یہ سب کہاں دیکھتی ہے۔۔۔والدین سے ضد کر کر کے مجھے شہر میں ایک گھر بنا کے دے دو ایک دن وہ لوگ بھی عاجز آ کر یوسف کی گھر کے سامنے ایک پلاٹ لے کے گھر بنا کر ہی دیا اللہ ان کو سلامت رکھے۔۔۔

طلاق کے بعد بیٹی ہوئی تھی۔میں بیٹی کے ساتھ اس گھر میں رہتی ہوں باقی بچے بھی آتے جاتے ہیں یوں میری دل کو بھی قرار آ گئی ہے اور زندہ رہنے کے لیے کچھ تو کرنا پڑتا ہے نا،بچوں کی ایک جھلک کی خاطر یہ جاب بھی میری ضرورت بن چکا ہے۔اللہ ہر بیٹی کو برے نصب سے بچائے۔آمین

❖❖❖❖❖

دُعا رائیگاں نہیں جاتی

وہ سر جھکا کے گھر کی طرف چل رہا تھا اور کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا نظر آ رہا تھا۔ چلتے چلتے رک کر ایک حسرت بھری نگاہ آسمان پر ڈالی اور پھر چلنے لگا وہ اپنی سوچ کے گھوڑے کو کبھی اِدھر تو کبھی اُدھر گھما رہا تھا۔ اسی سوچ میں وہ گھر پہنچا بیوی نے سلام دُعا کی تو وہ ہوں ہاں میں جواب دینے لگے۔ وہ کچھ فکر مند ہوتے ہوئے پوچھنے لگی۔ کیا ہوا علی؟ آپ آج بہت تھکے تھکے لگ رہے ہیں؟ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں۔ آپ نے کھانا کھایا ہے؟ دکان پر۔

کسی سے جھگڑا تو نہیں ہو گیا؟ ساجدہ نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔ علی نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور بیوی سے کہنے لگے بچے کدھر ہیں؟ کوئی نظر نہیں آ رہا۔ ہاں ادھر ہی ہوں گے۔ اچھا کیا بنایا ہے افطاری میں وہی جو روز بناتی ہوں۔ ہاں اس سال تو مہنگائی نے افطاری کا دسترخوان بھی چھوٹا کر دیا ہے۔ ساجدہ کہنے لگی آپ فکر کیوں کرتے ہو الحمدللہ فاقہ کی نوبت نہیں آئی ہے یہ بھی اللہ تعالیٰ کا شکر ہے ہاں نیک بخت بات تو تمہاری صحیح ہے لیکن اس مہنگائی کی وجہ سے دکھی بھی ہوں اور آج کل کاروبار کی حالت بھی ٹھک نہیں ہے اوپر سے۔۔۔ بیوی بولی اوپر سے کیا ہے؟ اس موضوع پر ہم افطاری کے بعد بات کرتے ہیں۔ ٹھیک ہے۔ پھر سب نے مل کر افطاری کی اور سب نماز وغیرہ پڑھنے میں لگ گئے رات کو جب سب کاموں سے فارغ ہو کر بستر پر آئی تو ساجدہ نے پھر پوچھا شوہر سے علی کیا بات ہے آپ پریشان کیوں ہے بتاؤ تو سہی سوچتے ہوئے کہنے لگے میں اس لیے پریشان ہوں آج نور کا سسر آیا تھا اور کہہ رہا تھا کہ رمضان کے فوراً بعد شادی رکھ دیں اور میں سوچ رہا ہوں کہ اتنی مہنگائی ہے۔ رمضان کے خرچے، عید کی خرچے، اس کے فوراً بعد شادی آج کل کاروبار بھی اچھا نہیں ہے۔ میرا تو سوچ سوچ کے دماغ پھٹنے لگا ہے۔ ہوں (ہاں) بات تو پریشانی کی ہے لیکن آپ اتنا مت سوچیں اور خود کو مت تھکائیں (ہلکان کریں)۔ اللہ ہے نا وہی کوئی راہ نکالے گا۔ ان شاء اللہ آپ سو

جائیں۔علی سو گیا۔لیکن ساجدہ سو نہیں سکی۔رات کو جاگتے ہوئے سوچتی رہی۔کیا کروں کس طرح یہ سب انتظام ہو گا سب؟ میرے اللہ تو ہی مددگار ہے۔دُعا کر کے وہ بھی سو گئی۔رمضان المبارک کے دن گزرتے گئے اور ساجدہ اور علی بچوں کے سامنے ہنسی مذاق کر کے اپنے پریشانی کو چھپاتے لیکن رات کو دونوں پریشان ہوتے ایک دوسرے کو تسلی دلاسے دیتے دُعا کرتے اسی طرح پہلا عشرہ اختتام پذیر ہو گیا۔دوسرا عشرہ آخر پر تھا،ساجدہ پورے خضوع سے اللہ کی حضور فریاد کرتی کیونکہ اسے پتہ تھا کہ اس مبارک مہینے کی ہر ساعت بہت قیمتی ہے ان میں مانگی ہوئی دُعائیں کبھی رد نہیں ہوتی اس امید پر وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی حضور جھولی پھیلانے میں مصروف رہی اور دوسرے کام کاج کے ساتھ ساتھ اپنی بیٹی کو افطاری کے ہدایت دیتی اِدھر اُدھر کے کاموں میں دھیان لگانے کی کوشش کر رہی تھی اتنے میں باہر کا دروازہ کھول کے علی اندر آرہا تھا وہ جلدی سے اس کے پاس آئی اور کہنے لگی آپ آج جلدی کیوں آئے ہیں طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟ وہی عورت کی عادات ایک ہی سانس میں کئی سوال کرنا میں بالکل ٹھیک ہوں تمہارے لیے ایک خوش خبری ہے اس لیے جلدی آگیا۔اچھا کیا پیسوں کا بندوست ہو گیا ہے؟ کس نے دیا کتنا دیا؟

اُف مجھے بولنے کا موقع تو دو بتاتا ہوں،پیسوں کا بندوست تو نہیں ہوا لیکن آج نور کے سسر پھر دوکان پر آیا تھا۔اچھا کیا کہہ گیا۔یہ کہہ گیا ہے کہ آج کل مہنگائی بہت ہو گئی ہے سب مشکل میں پڑیں اس لیے ہم نے مشورہ کر کے یہ طے کیا ہے کہ ہم بہت سادگی سے عید کے دن نکاح کر کے دلہن کو لے جائیں گئے آپ کیا کہتے ہیں میں نے کہا نیکی کا کام ہے میں کیا کہہ سکتا ہوں آپ لوگوں نے اچھا فیصلہ کیا ہے اس دور میں اس سے زیادہ نیکی کیا ہو گی ٹھیک ہے اب میں جاتا ہوں سب سن کر ساجدہ نے سجدہ شکر ادا کیا اور کہا یارب تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے تو نے ہماری دُعا کو رائیگاں نہیں جانے دیا بلکہ ان مشکلات کو آسان کر دیا ہے سچ کہتے ہیں دُعا کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔اللہ تعالیٰ ہر وقت ہر مقام پر اپنے بندوں سے غافل نہیں رہتا۔سو،ہمیشہ یقین کے ساتھ دُعا کریں،اللہ ضرور قبول فرمائے گا۔

غیبت

ہمارے ہمسائے میں نورین خالہ بیمار تھیں اور میرا جذبہ خدا ترسی بھڑک اٹھا تو، میں امی سے اجازت لے کر خالہ نورین کی عیادت کو گئی تھی۔۔۔

ابھی خالہ کا حال چال پوچھ کے میں بیٹھی ہی تھی کہ خالہ کی بڑی بیٹی ثمینہ بھی کمرے میں آ گئی۔اس کے ساتھ دونوں چھوٹی بہنیں بھی تھیں،ثمینہ اپنی امی سے کہنے لگی پتہ ہے امی آج ہماری گلی میں وہ تحمینہ نہیں ہے وہ بڑے میک اپ کر کے جا رہی تھی۔اچھا کدھر جا رہی تھی؟۔امی بھی بیماری بھول کے پوچھنے لگی، پتہ نہیں میں نے پوچھا نہیں، پھر منجھلی بولی،کل خالہ کہہ رہی تھی۔زہرا شہر یونیورسٹی میں پڑھنے جا رہی ہے۔اچھا کس کے ساتھ؟ کسی کے ساتھ نہیں ہمارے خالہ کے گھر میں لڑکیاں کسی کو ساتھ نہیں لے جاتیں۔جدھر جانا چاہیں خود سے چلی جاتی ہیں، اب شہر میں پڑھنے وہ بھی اتنی دُور استغفرُ اللہ۔میں یہ سب سن اور دیکھ رہی تھی اور دل ہی دل میں استغفر اللہ کا ورد بھی کر رہی تھی۔۔۔

بیٹیوں کی بات سن کر خالہ نے ڈانٹنے کی بجائے خود بھی مزے لے لے کر سننے لگی اور ان کو یہ ادراک بھی ہو رہا تھا کہ وہ لوگ غیبت کر کے کتنا گناہ کما رہے ہیں۔انہوں نے اسے برا فعل سمجھا ہی نہیں، میں بہت بے زار ہو کر ان کے گھر سے نکل آئی اور دن بھر ان کی باتیں دماغ میں گردش کرتی رہیں، رات کو جب بستر پر لیٹ کر میں پھر ہمسایوں کو سوچنے لگی کہ خالہ نورین کے تین بیٹے دو بیٹیاں برسرِ روزگار ہیں۔ماشاءاللہ سے گھر بھی اچھا خاصا ہے، کچھ زمیں بھی ہے۔ بچوں کی تنخواہ بھی ٹھیک ٹھاک ہونے کے باوجود خالہ ہر وقت خرچہ پورا نہ ہونے کا رونا روتی رہتی ہے اور تو اور یہ بھی کہتی نظر آتی ہے کہ قرض بہت چڑھ گیا ہے۔خالہ کی امی سے کرتے ہوئے یہ باتیں سن کر میں حیران پریشان خالہ کو دیکھتی رہتی تھی اور آج تک کوئی سوال نہیں کر سکا تھا کہ اتنی آمدنی کے باوجود خرچہ پورا کیوں نہیں ہوتا ہے؟ اور قرض کیوں چڑھتا ہے؟ آج دن

بھراوررات کوبھی خالہ نورین کوسوچتے سوچتے یہ انکشاف ہوا کہ غیبت کرنے سے بھی رزق میں برکت ختم ہو جاتی ہے۔ چاہے سارے گھر والے مل کے ہی کیوں نہ کما لیں۔ جب تک ہم اللہ اور رسول کے منع کئے ہوئے برے کاموں سے خود کو نہ بچائیں۔ ان برائیوں کو نہ پہچانے کہیں کچھ نہ کچھ غلط ہمارے ساتھ ہوتا ہی رہے گا۔

❖❖❖❖❖

بیٹی

ڈاکٹر،صفیہ کو اندر آپریشن تھیٹر میں لے گیا تھا اور باہر میں اپنے گھر والوں اور صفیہ کی ماں باپ کے ساتھ سراپا دعا بنی ہوئی تھیں۔۔۔

ہمارے تین چھوٹے چھوٹے بیٹے تھے،اب یہ چوتھا ڈیلیوری تھا صفیہ کی مجھے بیٹی کی بہت خواہش تھی اور دُعا کرتا رہتا کہ اللہ مجھے اپنے رحمت سے بھی نواز دے،ایک گھنٹے کی جان لیوا انتظار کے بعد ڈاکٹر صاحبہ نے خوشخبری سنادی،مبارک ہو،آپ لوگوں کو، بیٹی ہوئی ہے۔۔۔ میں آگے بڑھ آیا۔۔۔شکریہ ڈاکٹر صاحبہ۔۔۔دونوں ٹھیک ہے نا۔۔جی الحمداللہ۔۔۔زچہ بچہ دونوں باکل خیریت سے ہیں۔۔۔ابھی روم میں شفٹ کرتے ہیں۔۔پھر ملیں۔۔۔ملنے کی اجازت ملتے ہی میں بے قراری سے اندر گیا۔۔۔صفیہ سے حال احوال پوچھنے کے بعد بچی کی طرف بڑھا۔۔اور جھپٹ کر بچی کو گود میں اٹھالیا۔۔خوشی کے مارے میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔۔اور ایسا لگتا تھا کہ کل کائنات،میری باہوں میں آگیا ہے۔۔۔

کرم کیا ہے۔۔۔میں اس لائق نہیں تھا۔۔۔لیکن جب اللہ تعالیٰ اپنی رحمت برسانا چاہے،تو،میرے جیسے گناہ گار کی دُعا بھی قبول کر لیتا ہے۔۔۔اور اپنی رحمت کو مجسم کر کے دلوں کو ٹھنڈک دیتا ہے۔

جس گھر میں بیٹی نہ ہو،صرف بیٹے ہو، وہ گھر بھی کیا گھر ہے؟ عجب اداسی بھری رہتی ہے۔نہ ہنسی،کی آواز نہ جھگڑنے کی، نہ شکایتیں لگانے والے،نہ سہیلیوں کا آنا جانا،نہ ماں،کو بیٹھا کے خود کام کرنے کی ضد کرنے والی، جہاں بیٹی نہ ہو،وہ گھر صرف مکان لگتا ہے۔۔۔آج سے میرا گھر مکان نہیں گھر بن گیا ہے۔۔۔تین دن بعد صفیہ کو گھر لے آیا اور میرا زیادہ تر وقت صفیہ کی سرہانے گزرنے لگا تھا۔۔۔امی ابو اور سب گھر والے مرا یہ دیوانگی دیکھ کر کہتے۔۔۔ بلال،تم تو زن مرید ہوگئے ہو۔۔

میں مسکرا کے کہتا، آپ سب کو پتہ ہے میں زن مرید نہیں ہوں، میں تو اللہ کی اس رحمت کے گرد گھوم رہا ہوں، جس کو میرے آنگن میں اتار کر اللہ نے میری زندگی مکمل کر دی ہے۔۔۔ابو کہنے لگے، بے شک۔۔۔اور میرے بیٹے کہتے، ابو گڑیا کے آنے کے بعد آپ ہم سے سوتیلوں والے سلوک کرتے ہیں۔۔۔

نہیں میرے جان آپ تینوں تو میرا سانس ہو اور بیٹی میری آنکھ۔۔۔بس یہ بہت دعاؤں اور منتوں کے بعد آئی ہے تو اس کو تھوڑا زیادہ وقت دے رہا ہوں، آپ لوگوں نے جیلس نہیں ہونا، میں نے اپنے تینوں بیٹوں کو باہوں کے حلقے میں لے کر پیار کرتے ہوئے کہا۔تو تینوں یک زبان کہنے لگا، ہم جیلس نہیں ہو رہے ابو ہم تو خود اتنے خوش ہیں۔۔۔سکول میں سب کو فخر سے کہتے ہیں کہ ہمارے گھر ایک خوبصورت اور پیاری سی گڑیا آئی ہے۔۔۔ماشاءاللہ، اللہ تم سب بہن بھائیوں میں ہمیشہ اس محبت کو قائم رکھیں۔آمین

اور میں آٹھ کے بچی کی پاس گیا۔جس کا نام ہم نے کرن فاطمہ رکھا ہے۔۔۔جس طرح اس کرن نے میری زندگی کو روشن کیا ہے۔۔۔اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ میری کرن فاطمہ کا بخت روشن رہے، وہ آباد اور سکھی رہیں۔۔۔آمین

❖❖❖❖❖

بیوی

کبھی کبھی انسان وہ سب کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔اپنے سے جوڑے رشتوں کی خاطر ان کی سکون اور آرام کی خاطر خود کو بھری بازار میں نیلام تک کر دیتی ہیں۔۔۔آج میں بازار گئی تھی۔خریدنا کچھ خاص نہیں تھا۔۔۔گھر میں بور ہونے لگی تو ونڈو شاپنگ کا سوچ کر گھر سے نکلی تھیں۔۔۔

بازار میں ادھر ادھر گھومتی میں فٹ پاتھ پر چلی جا رہی تھی۔اچانک میری نظر فٹ پاتھ کے کونے میں بیٹھے خود کو میلے چادر میں چھپائے وجود پر پڑی،وہ سر جھکائے دامن پھیلائی بیٹھی تھیں۔۔۔

میں نے کچھ نوٹ جیسے ہی اس کے گود میں ڈالی،اس نے نظر اٹھائی اور میں دنگ رہ گیا۔رقیہ تم؟ تم ادھر کیسے؟ میں ہکا بکا ہو کر بے ڈھنگے سوال پوچھ رہی تھی۔۔۔اور ساتھ بیٹھ بھی گئی،وہاں پر ہی میں نے سوال کرنا شروع کیا۔تم تو کہیں جاب کر رہی تھی۔۔۔پھر ادھر؟ بس باجی شوہر کئی عرصہ سے بیمار تھا۔تو میں خود محنت مزدوری کر کے گھر چلانے لگا۔۔

اس وقت وہ اپنا خیال خود رکھ سکتا تھا۔اب وہ بستر پر پڑا ہوا ہے۔نہ ماں باپ پلیٹ کے دیکھتا ہے۔نہ بہن بھائی،سب نے روزی سے منہ موڑ لیا ہے۔۔۔

میں ایسا نہیں کر سکا،اب روزی کو میری دیکھ بھال کی ضرورت ہے۔۔۔اس لیے میں نے جاب چھوڑ دیا،روزانہ دو دو پیمپر بدلنا پڑتا ہے۔۔۔اب تو گھر میں کھانے کو بھی کچھ نہیں ہوتا ہے۔۔۔اس کے لیے تو میں بھوکی بھی رہ سکتی تھی۔لیکن سارا مسئلہ روزی کی آرام کا تھا پیمپر کے پیسے نہیں تھے۔۔۔اس لیے میں نے اپنی اَنا،اپنی نسوانیت سب کچھ پسِ پشت ڈال کر بھیگ مانگنے نکلی ہوں تاکہ پیمپر کے خرچے تو پورا ہو،یہ کہتے ہوئے رقیہ کا درد آنکھوں سے بہ کر رو من بھگو رہی تھی۔۔۔

تقدیر کا کھیل

میرا تعلق گاؤں سے ہے لیکن میں رہتی شہر میں ہوں، گاؤں سے شہر آنے کا ایک نقصان یہ بھی ہے۔ کہ گاؤں سے جو بھی کسی بھی کام کے واسطے شہر آتا ہے تو شامت شہر میں رہنے والے کی آتی ہے۔۔۔ہاہا گاؤں سے انے والوں کو ہسپتال لے جاؤ، شاپنگ پر لے چلو، غرض چکی بنی رہو،، ہاہا۔۔۔

اسی لیے مجھے بار بار گل ناز کی کلینک پر جانا پڑتا، کم بختوں کو اس پر اعتماد بھی اتنا تھا۔ کہیں اور جانے کا نام ہی نہیں لیتی۔۔۔میں جب بھی گل ناز کی کلینک پر جاتی، میری نظر اس کی حسین سنگ مرمر جیسی سراپے سے ہٹتی نہیں تھی۔۔۔

جتنی دیر وہاں بیٹھتی میری نظریں اس کی ہر حرکات پر رہتی، وہ تھی بھی اتنی حسین کہ اس سے نظریں ہٹانے کو دل نہیں چاہتا تھا۔۔۔میں ہمیشہ کسی نہ کسی مریض کے ساتھ کلینک پر جاتی تھی۔اور اس سے خوب ساری باتیں بھی کرتیں، میں کوئی لڑکا نہیں تھا نہ وہ، پر گل ناز اتنی پرکشش اور خوبصورت شخصیت کی ملکہ ہے جو بھی دیکھیں کچھ دیر کے لیے رک ہی جاتا، اس کی لفظوں سے پھول چھڑکتے ہیں اور اس کی ہاتھوں میں ایسی شفاء۔۔۔کہ دس/بیس سالوں کی بانجھ عورتوں کی بھی علاج ہو جاتا، یہاں گل ناز کے نام کا چرچا تھا۔۔۔ڈاکٹروں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا تھا۔۔۔ mbbs دُور دراز سے خواتین ان کے پاس آتی، اس نے میری خیال میں کچھ لوگ ان کو دیکھ کر ہی ٹھیک ہوتی ہوگی۔۔۔

پر وہ شادی شدہ نہیں تھی، میں ہمیشہ اسی الجھن میں رہتی، اس کے لیے کتنے رشتے آئے ہوں گے۔۔۔لیکن اس نے پتہ نہیں شادی کیوں نہیں کیا ہے۔۔۔لیکن پوچھنے کی ہمت کبھی نہیں ہوئی تھی۔۔۔

لیکن آج کل اڑتے اڑتے یہ بات سنے میں آرہی تھی گل ناز نے خفیہ شادی کر رکھی ہے

اپنے باس سے، یہ سن کر حیران ہونے کے ساتھ ساتھ دُکھ بھی بہت ہوئی، ان کی باس تو چھ بچوں کے باپ تھے اور ان کی ساتھ گل ناز کی شادی؟ یہ ہضم ہونے والی بات تو نہیں تھی۔۔۔

اپنی الجھن کو ایک دن میں نے زبان دے دی، باجی ایک بات پوچھوں؟ ڈرتے ڈرتے میں نے آخر سوال کر ہی دیا، کیونکہ کسی کی زندگی کے بارے میں سوال بہت مشکل اور ذلیل کروانے والی بات ہے نا۔۔۔لیکن باجی گلناز نے اپنی ازلی نرم مسکراہٹ کے ساتھ کہا، ارم کیا بات پوچھنی ہے؟

آپ صاحب جائیداد ہیں، خوبصورت ہے، ان کے ہاتھوں اور کانوں میں کروڑوں کے سونے ہوتی تھی۔۔۔اتنا عرصہ آپ نے شادی کیوں نہیں کیا؟ اور اب سنا ہے آپ نے شادی کیا ہے اور وہ بھی چھ بچوں کی باپ سے، کیا یہ سچ ہے؟ میں نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالی، پر وہ ناراض نہیں ہوئی، بس مسکراتی رہی اتنی تجسس کیوں؟ تم کو میری بارے میں؟، بس ہو گئی کیا کروں۔اچھا ویسے میں کسی کو اتنا سوال کرنے کی اجازت نہیں دیتی ہوں، میرے بہت قریبی لوگ بھی صرف اندازہ ہی لگا رہے ہیں۔۔۔۔پر دل چاہتی ہے تمہاری تجسس دور کر ہی دوں، ہاں میرے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے مجھے کسی بھی چیز کی کوئی کمی نہیں ہے۔۔۔اور میرے والدین بہن بھائی سب چاہتے تھے میں اپنا گھر بساؤں، پر یہ جو ہم لوگ کہتے ہے نا سب ہمارے ہاتھ میں ہے ہم چاہے تو کچھ بھی کر سکتے ہیں ہم خود نہیں چاہتے اس لیے ہم پیچھے رہ جاتے ہیں ترقی نہیں کرتے ہیں۔۔۔

لیکن جہاں تک میرا تجربہ ہے جو کچھ تقدیر میں لکھی جاتی ہے ہمیں وہی ملتی ہے کبھی آپ کے پاس وہ سب کچھ ہوتیہوئے بھی تقدیر کے سامنے بے بس ہو جاتی ہے۔۔۔جیسے میں میرے پاس نہ حسن کی کمی تھی نہ مال وزر کی اور نہ رشتوں کی، سب میرے میری والدین کی منتیں کرتے تھے۔۔۔اور ہر والدین کی خواہش ہوتی کہ میں ان کی بہو بنوں اور میں انکار پہ انکار کرتے گئے۔۔۔

پھر مجھے اپنے باس جس کے چھ بچے ہیں انہوں نے اپنا رشتہ دیا تو میں انکار نہیں کر سکا

کیونکہ وہ مجھے پسند آ گیا تھا۔یوں میری اور اس کی شادی ہو گیا۔۔۔شادی تو میں نے کر لیا لیکن مجھے شوہر آدھے سے بھی آدھی مل گئی ہے۔۔۔

ایک تو گھر والوں سے چھپ کے دوسرا ان کے گھر والوں سے تیسرا دنیا سے بس ایک بندھن میں بندھنا میں نے منظور کیا۔۔۔میں تو خسارے میں رہ گئی ہوں نہ میں ان کے ساتھ شاپنگ پر نہ کہیں گھومنے پھرنے جا سکتی ہوں، ہمیشہ یہی دھڑکا کہیں کوئی دیکھ نہ لیں، اب تم خوش ہو گیا؟ نہیں میں بہت زیادہ دکھی ہو گئی ہوں، یہ خوشی سے زیادہ دکھ کی بات ہے اتنے خوبصورت آپ ہو آپ کی دل آپ کے ساتھ تو یہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔۔۔اب کیا کیا جا سکتا ہے اب تو ہو گیا ہے لڑکی یہ سب تقدیر کا کھیل ہے اور تقدیر کے ساتھ تو ہم لڑ نہیں سکتیں نا۔۔۔

❖❖❖❖❖

زندگی تیری دوڑ دھوپ

میری والد کا انتقال ہوا تھا۔ہم پانچ بہنیں تھیں۔ہمارا کوئی بھائی نہیں تھا۔امی ابو نے ہمیں بیٹوں کی طرح پالا اور ہمیں اعلیٰ تعلیم دلوائی، بڑی بہن گورنمنٹ ٹیچر ہے باقی تین بہنیں ہاؤس وائف ہے پر میں جاب کرتی تھی ایک پرائیویٹ محکمہ میں، میری شادی کزن سے ہوگئی تھی اور میری ساس یعنی میری خالہ نہیں چاہتی تھی کہ میں جاب کروں، کیونکہ ان کا خیال تھا جاب کرنے والی خواتین اپنے شوہر کی عزت نہیں کرتی، پر میں نہیں مانی اپنی اتنی اچھی جاب چھوڑنے پر،سو خالہ کو ہار ماننی پڑی اور میں نے اپنی جاب جاری رکھی، میری خالہ لوگ گاؤں میں رہتے تھیں اور میں شہر کی پلی بڑھی تھی۔آفتاب کی جاب بھی شہر میں تھا۔میری جاب ایک الگ شہر میں،سو مجھے،سسرال میں رہنے کا تجربہ نہیں ہوا۔

میری جاب ایسی تھی کہ مجھے شہر،شہر،گاؤں، گاؤں، جانا پڑتا،آفتاب ڈیوٹی کی وجہ سے ہمیشہ میرے ساتھ نہیں ہوتا تھا۔۔۔میں کبھی ہاسٹل میں رہتی تو کبھی امی ساتھ جاتی، یوں میں نے آرام دہ زندگی کے باجائے،خود کے لیے ایک مشکل زندگی کو چنا۔سال دو سال بعد اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنی رحمت سے نوازا اور خوبصورت سی بیٹی میری گود میں آگئی تھی۔۔۔پر اس کو دینے کے لیے میرے پاس بہت کم ٹائم ہوتا تھا۔کبھی کہیں ٹرینگ تو کبھی کہیں پروزٹ کا سلسلہ چلتا،اس بات پہ کبھی آفتاب سے ان بن بھی ہو جاتا، وہ کہتا،مہناز تم جاب ہی چھوڑ دو،غریب بچی کو دیکھو،ماں کی گود کے لیے ترس ترس جاتی ہے۔۔۔تمہاری جاب اتنی بھی ضروری نہیں،ان شاءاللہ تم فاقوں سے نہیں مرے گا، ہمارے لیے میرا جاب کافی ہے تم اس بچی کو یوں مت ترساؤ،نہیں آفتاب میں نے تعلم اس لیے تو حاصل نہیں کی تھی کہ میں گھر بیٹھ کر بچے پالوں، میں نے خود کو منوانا ہے، میں لوگوں کو دکھاؤں گی کہ عورت اتنا بھی کمزور نہیں جیسے لوگ سمجھتا ہے۔۔۔میں دکھاؤں گی کہ عورت کتنا مضبوط ہے۔وہ بھی وہی سب کچھ کر سکتے ہیں جو

مرد کرتے ہیں اور آفتاب بے بس ہو کے چپ ہو گیا۔۔۔اور میں اپنی ڈگر پر چلی، میں کسی کی سنتی بھی کم تھی۔ میں نے جاب کے ساتھ اپنی تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رکھا، اور ساتھ بچوں کی پیدائش کے عمل سے بھی گذرتی رہی اور اللہ نے مجھے اپنی 5 رحمتوں سے نوازا گیا۔۔۔لیکن نعمت سے مجھے محروم رکھا گیا۔میرا اپنا کوئی بھائی نہیں تھا۔دل چاہتی تھی بھائی نہ سہی ایک بیٹا عطا فرمائے تو اللہ تیرا مہربانی ہوگی پر یہ خواہش پوری نہیں ہوئی، میری ساس چاہتی تھی کہ آفتاب دوسری شادی کریں تاکہ ایک وارث ملے لیکن آفتاب تو میری زبان بولتے اور میری آنکھ سے دیکھنے والا شوہر تھا وہ کی اپنی ماں کو ہاں کر دیتا، میں ساتھ اپنی تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رکھا اور جاب کو بھی بچوں کو بہت مسئلہ ہوتا تھا کبھی ادھر کبھی ادھر تو کبھی گھر میں ہی رکھ کے جاتی، میرے ساتھ ایک افسر تھا ابراہم ثنائی صاحب۔اس نے جاب چھوڑ دیا اور وہ سیاست میں چلا گیا اور الیکشن لڑ کے جیت گیا۔۔۔اس نے پہلے اپنے پانچ سال پورا کرنے کے بعد مجھے بھی سیاست میں آنے کا مشورہ دینے لگا لیکن میں نے کہا ثنائی صاحب میں اور سیاست میں تو سیاست کے الف سے بھیواقف نہیں ہوں، لیکن وہ نہیں مانا اور میں نے بھی سوچا کیا ہے ٹرائی کرنا چاہے ہے ہر لمحہ قسمت آزمانا چاہے ہے یوں میں اس بار ٹیکنو کریٹ جو لیڈیز سیٹ تھی، پر جیت گیا۔جب میں اپنے علاقے میں آئی تو استقبال کے لیے لوگوں کا ایک جم غفیر تھا پھولوں کی ہار کے ساتھ طرح طرح کی خوش میواجات بھی تھے میں دل ہی دل میں اللہ کے حضور سجدہ ریز ہونے لگی کہ میرے رب نے میری حصہ میں اتنی چاہت اور عزت لکھ رکھا ہے۔پھر آگے بہت مشکلات بھی آئیں اور میں ان سے گزرتی گئی اب جنرل الیکشن قریب آرہے تھے اور میرا ارادہ جنرل الیکشن لڑنے کا تھا۔۔۔اس کے لیے میں نے علاقے کی سرکردہ گان کو جمع کیا اور ان سے مشورہ کیا کہ۔میں یہ چاہتی ہوں آپ لوگوں کا کیا خیال ہے؟ سب نے یک زبان ہو کر کہا باجی ہم آپ کی شانہ بشانہ ہے آپ اللہ کا نام لے کر درخواست جمع کروائے۔اس طرح میں نے فارم جمع کیا۔۔۔آگے کنوسینگ کا مرحلہ آیا اس کے لیے گاؤں گاؤں محلّہ محلّہ جانا پڑتا، جس گاؤں یا محلے میں میں خود نہیں جاتی تو وہ لوگ ناراض ہونے لگتا کہ باجی خود کیوں نہیں آتی، عورتیں کہتی ہمیں

ایک بار باجی اپنا دیدار تو کراتے جائیں اور مجھے لوگوں کی جزبات کا احترام بھی کرنا پڑتی وہ صرف ووٹرز نہیں انسان بھی تھے۔۔۔

بحرحال وہ دن بھی آ گیا جس کا میرے ساتھ ساتھ میری ووٹرز کو بھی انتظار تھا میں تین چار دن سے صبح اس گاؤں میں تو بارہ بجے اس گاؤں میں شام کو ایک اور گاؤں لگتا جیسے ایمرجنسی نافذ ہو گئے ہیں۔۔۔

صبح کے ساتھ 7 بجے میں نے اپنے گاؤں سے پہلا ووٹ کاسٹ کر کے ووٹ کا آغاز کیا۔۔پھر میں گاؤں گاؤں نکل آئی،شام ہوتے ہوتے عزیز رشتہ دار چاہنے والے ووٹرز سب کی نظریں ٹی وی سکرین پر لگے ہوئے تھے۔۔۔

جیسے جیسے خبر دیکھتے جاتے لوگوں کی جوس بڑھتی گئی،اس گاؤں سے مہناز آفتاب آگے ہے فلاں گاؤں سے گنتی میں مہناز صاحبہ جیت رہی ہے۔پھر ایک دم گنتی نے پلٹا کھایا،سارے ششتہشر رہ گئے۔19 ووٹ کی کمی سے مہناز آفتاب ہار گیا ہے۔۔۔یہ خبر سب پر بجلی بن کے گرا تھا جو لوگ دن رات میرے ساتھ تھا اور سارے ووٹرز سب رونے لگ گیا اور ہار ماننے کو تیار نہیں تھا۔۔۔کیونکہ یہاں چیٹنگ ہو گیا تھا۔۔۔ورنہ روز روشن کی طرح عیاں تھی کہ میں جیت رہی تھی 19 کا فرق ڈالا گیا تھا۔۔ایک لمحے کے لیے یہ سن کر میں بھی چکرا گئے لیکن دوسرے لمحے میں سب کو تسلی دینے لگے کیونکہ میں تو خود چٹان ثابت کرنا چاہتی تھی میں اس لیے تو نہیں لڑا تھا ہارنے پر دل ہی ہار بیٹھوں،دوبارہ بھی اٹھنے کی حوصلہ کے ساتھ میدان میں اتری تھی سو میرا جدوجہد جاری رہے گی۔۔۔

❖❖❖❖❖

نیکی

مجھے لگتا ہے کائنات کی ساری رنگینی کا دارومدار محبت اور نیک بیوی ہے۔ جو اللہ کی دی ہوئی نعمت میں سے ایک بہترین نعمت ہے۔۔۔ عقیل فون پر مجھ سے باتیں کرتے ہوئے بتا رہے تھے۔۔۔ اور میں ہنسنے لگی۔ ساتھ میں پوچھا۔ اچھا یہ آپ کو کب پتہ چلا؟ کیا؟ یہی کہ نیک بیوی کے نعمت ہونے کا! جب سے تم سے شادی ہوئی ہے۔ وہ کیسے؟ بتاتا ہوں، کسی دن فرصت میں اور یہ فرصت کب ملے گی آپ کو؟ تم دل چھوٹا مت کرو، ان شاء اللہ کسی دن ملے گی نہ فرصتا آپ کو گئے ہوئے چھ سال ہو گئے اور مجھے اس ایک دن کا انتظار کرتے ہوئے، ہاں سلمٰی مجھے احساس ہے بلکہ احساسِ جرم بھی ستاتا ہے۔۔۔ لیکن میں ایک باپ بھی ہوں نہ اس وجہ سے بہت مجبور ہوں، ہاں ہاں باپ کا فرض ادا کرنا آپ کو یاد رہا اور بیوی صرف نعمت ہے یہ یاد رہ گیا آپ کو، بیوی کے کیا حقوق ہیں؟ یہ بھول گئے آپ۔ کہتے ہوئے میری آواز رندھ گئی تھی۔۔۔ سلمٰی، سلمٰی! کیا تم رو رہی ہو؟ پلیز رو مت، تم کہو تو میں آج ہی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے آجاتا ہوں۔ تمہارا مجھ پر بہت احسان ہے۔ یہ کیا کم ہے کہ تم نے میرے بچوں کو سنبھال لیا ہے۔ بچوں کو میرے پاؤں کی زنجیر نہیں بننے دیا، میرا گھر بار سنبھال رکھا ہے۔۔۔ میں نے اپنی سسکی کو دباتے ہوئے کہا نہیں آپ کو آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب تو بس دو سال رہ گئے ہیں۔ اس کو پورا کر کے آیئے گا۔ جہاں میں نے اتنا صبر کیا ہے وہاں دو سال اور سہی۔ یہ کہتے ہی میں نے کال کاٹ دی اور اپنے آنسوؤں کو بہنے دیا تاکہ دل کا بوجھ ہلکا ہو سکے۔۔۔ میری پہلی شادی کی ناکامی کے بعد ان کی وجوہات کا میں یہاں ذکر نہیں کروں گی، ایک بیٹی کے ساتھ میں واپس آ گئی تھی، سال دو سال بعد میرے ماں، باپ نے دوبارہ میری شادی کر دی، عقیل کی بیوی چار بچوں کو چھوڑ کر وفات پا گئی تھی۔۔۔ میرے والدین نے عقیل سے میری شادی کروا دی۔ عقیل عمر میں مجھ سے دو گناہ بڑا تھا۔ لیکن قسمت کے لکھے کو کون ٹال سکتا ہے۔ جو

مجھے محبوب کے گھر سے نکال کے یہاں لایا تھا۔۔۔شادی کے دن عقیل کا میرے لیے پہلا جملہ یہ تھا۔۔۔سلمیٰ آپ کو پتہ ہی ہے میرے چار بچے ہیں۔جو مجھے بہت عزیز ہیں۔تم اگر اپنی بیٹی کو ساتھ لے آتی تو میں اسے بھی قبول کر لیتا اور ہمارے پانچ بچے ہوتے، خیر اب بھی تم رکھنا چاہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔۔۔جی ٹھیک ہے۔

میں نے کہا۔اگلی صبح ایک نئی زندگی کی شروعات میری منتظر تھی۔۔۔اٹھ کے میں نے ناشتہ بنایا ہمارے ساتھ بھابھی اور بچوں نے بھی آکے ناشتہ شروع کیا نئی دلہن کی دعوت کرنے کی بجائے خود اس سے کھانا بنوایا گیا۔۔۔میں نے اس کو بھی اپنی نئی زندگی کا حصہ سمجھ کر قبول کر لیا، ناشتے سے فارغ ہو کر گھر کی صفائی شروع کی کیونکہ گھر کو ایک عرصہ سے کسی نے ہاتھ نہیں لگایا تھا ۔۔۔ساس تھی پر وہ اپنے ہی دھن میں رہنے والی لگی اور بھابھی بھائی صرف مال و زر کی کھوج میں رہنے والے ایسے میں میں نے گھر کو اپنا گھر سمجھ کے سنبھالنے لگی۔شادی کے دو ماہ بعد ہی عقیل اپنی چھٹی کاٹ کے سعودیہ چلا گیا۔وہ روزی کی خاطر پردیس کی خاک چھاننے نکلا ہوا تھا۔سو بچوں کا ماں باپ مجھے بننا پڑا۔ بچے جب مجھے ماں کا درجہ دینے لگتے تو کبھی دادی ان کو ورغلاتی۔کبھی تائی ان کے کان بھرتی، بچے مجھ سے روٹھ جاتے اور مجھے طرح طرح کی تکلیف دیتے، میں ان کو بہلا پھسلا کر اپنی طرف لے آتی، پھر ایک دن میری اجڑی گود میں بلال آ گیا تو میں نے اپنے رب کا شکر ادا کیا۔۔۔محسن، مہناز اور شکیل اب بڑے ہو گئے تھے۔وہ تینوں پڑھنے کے لیے شہر گئے تو گھر کی رونق بھی ساتھ لے گئے۔ابھی میرے پاس حیدر اور بلال تھے ۔۔۔میٹرک کے بعد حیدر بھی چلا گیا۔اب میں اور بلال ہی رہ گئے تھے۔عقیل کو گئے 6 سال کا عرصہ ہو گیا تھا ان کے عقامے کا کوئی مسئلہ ہو گیا تھا۔۔۔اس وجہ سے وہ پاکستان نہیں آ رہے تھے اگر چھوڑ کے آتے تو دوبارہ جا نہیں سکتے تھے۔آگے بچوں کی مستقبل کا مسئلہ تھا کوئی نہ کوئی مزدوری تو کرنی تھی۔۔۔اور اس کے لیے میں نے ان کی جدائی برداشت کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ساتھ ساتھ ان کے اس مسئلے کے حل کے لیے دُعائیں اور صدقات بھی جاری رکھے جو ابھی تک قبول نہیں ہوئے تھے۔۔۔اس کے باوجود میں مطمئن تھی کہ میرا کیا ہے؟ زندگی گزر جائے گی پر

بچوں کی تعلیم تو مکمل ہو جائے گی۔ دن رات دُعائیں مانگ رہی تھی۔ آج صبح عقیل کی کال آئی تو مجھے اس کی آواز میں کچھ غیر معمولی خوشی محسوس ہوئی تو پوچھا کیا بات ہے؟ آج آپ کی آواز میں کچھ خوشی محسوس کر رہی ہوں، ہاں آج میں بہت خوش ہوں تم نے جو نیکی میرے اور میرے بچوں کے ساتھ کی ہے۔ اس کے صلے میں۔ جلدی بتائیے نہ کیا ہے؟ آپ آ رہے ہیں کیا؟ میں سنے بغیر بولتی جا رہی تھی، نہیں تم آ رہی ہو۔ کیا؟ پھر بولیے ہاں ملک نے کہا ہے تم جا نہیں سکتے ہو۔ لیکن تمہارے بچوں کو تم بلایا جا سکتا ہے۔ اچھا تو آپ ہمیں بلا رہے ہیں۔ یہ سن کر میری دھڑکن تیز ہو گئی تھی اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے تھے نیکی کا تو نہیں پتہ لیکن اتنا بڑا صلہ مجھ سے سنبھالا نہیں جا رہا تھا، دل اللہ کے حضور سجدہ ریز ہونا لگا۔ آپ نے اتنی بڑی خوشی دی ہے۔ میں اپنے اکیلے پن میں جھیلے گئے دکھ، درد پر آپ کو معاف کرتی ہوں۔ میں آنسوؤں میں مسکرا رہی تھی اور کائنات آج سے پہلے اتنی حسین نہیں لگی تھی۔ میں بھی سعودیہ جاؤں گی یہ تصور ہی روح کو سرشار کرنے لگی دنیا کی جنت میں جہاں رسولِ خدا کی خوشبو بسی ہوئی ہے۔

❖ ❖ ❖ ❖ ❖

پانی کا بلبلہ

آج وہ بہت خوش تھی خوش کیوں نہ ہوتی، شادی کے پورے 10 سال بعد اللہ تعالیٰ نے بہت منتوں، حاجتوں کے بعد اس کی دُعا سن لی تھی اور اس کی گود ہری ہونے والی تھی جب سے یہ بات گھر والوں کو معلوم ہوئی تھی کہ ندا ماں بننے والی ہے۔اس کو ہتھیلی کا چھالہ، بنالیا تھا کسی بھی کام کو ہاتھ لگانے نہیں دیتے تھے، وہ جھاڑو اٹھاتی تو کوئی نند یا بھاوج آگے بڑھ آتی اور ہاتھ سے جھاڑو لے لیتی، وہ چولہے کے پاس جاتی تو ساس اسے وہاں سے اٹھا دیتی اور ساس ندا کو ناراض ہونے لگتی، اتنی منتوں کے بعد اب کہیں جا کے یہ دن آیا ہے اور تم اسے بھی کچھ کرنے پر تلی ہوئی ہو، بس میں نے کہہ دیا تم کوئی کام نہیں کروں گی۔تو نہیں کرتی، کبھی کبھی ندا اتنی زیادہ پروٹوکول پر الجھن کا شکار ہو جاتی، لیکن سب کی اتنی محبت اور آنے والے مہمان کی اہمیت کا اندازہ کر کے چپ ہو جاتی اور بے اختیار زبان پر شکر کے کلمات آجاتے کہ اس رب نے میرے جیسی گناہ گار کو اپنے کرم سے نوازا، جب سے ماں بننے کی خوش خبری سنی تھی۔۔۔دل میں محبت کا ایک دریا موجزن ہوتا دیکھ رہی تھی اور اس وجود سے جو ابھی انسانی شکل میں آیا بھی نہیں تھا اس پر پیار آجاتا، اور کبھی اپنے شوہر کے ساتھ اس کی باتیں کرتی، سنو محسن، جی بیگم سن رہا ہوں، بتاؤ، وہ شرما کے، کہتی، آپ کو اپنے بچے سے کتنا پیار کرتے ہیں؟ اس پر محسن کہتا استغفراللہ بیگم یہ کیسا سوال ہے؟ کون والدین ہوگا جس کو اپنے بچے سے پیار نہیں ہوگا، جی سب کو ہوتا ہوگا۔لیکن میں آپ کی بات کر رہا ہوں، آپ کو کتنا پیار ہے؟ وہ پُرسوچ انداز میں اپنے شوہر کو دیکھتے سوال کو دہرایا تو محسن کہنے لگے۔جتنا تم کو پیار ہے اتنا میں بھی اپنے بچے سے پیار کرتا ہوں، کیونکہ جتنی بے قراری سے تم نے اس کا انتظار کیا ہے۔اتنا ہی میں نے بھی کیا ہے۔۔۔اچھا ویسے لوگ کہتے ہیں نہ بچوں کو باپ سے زیادہ ماں پیار کرتی ہے۔وہ ہنسی کو ہونٹوں میں دباتی کہہ رہی تھی، جی نہیں باپ بھی اتنا ہی پیار کرتا ہے بس باپ کو صحیح طرح اظہار

کرنا نہیں آتا، اس لیے ماں سارے نمبر لے جاتی ہے۔۔۔اور باپ بے چارا دیکھتا رہجاتا ہے۔ محسن نے سنجیدہ ہوتے ہوئے جواب دیا، تو ندا کہنے لگی۔ارے ارے اب اتنی سنجیدہ صورت نہ بنالیں۔مان لیا باپ بھی بچوں سے اتنا ہی پیار کرتا ہے بلکہ، ماں سے بھی زیادہ پیدائش سے لے کر جوان ہونے تک بچوں کے ناز تو بابا اٹھاتے ہیں۔۔۔گرمی، سردی کی پرواہ کیے بغیر، اب آ گئی نا پوائنٹ پر، اب بتاؤ ماں زیادہ پیار کرتی ہے یا باپ؟ جی جی، وہ مسکرا رہی تھی اس چھیڑ چھاڑ میں ندا کو بہت مزا آ رہا تھا۔۔۔اور یہ سب بہت اچھا لگ رہا تھا۔ دن گذرتے جا رہے تھے اور وہ ہر گزرتے دن کے ساتھ ننھی سی کلی کے خیالوں میں ڈوبتے، ابھرتے تخلیق کے مراحل طے کر رہی تھی۔ساتھ میں یہ دُعا بھی وردِ زبان رکھتی، کہ اے اللہ میرے اس ننھے وجود کو صحیح سلامت رکھ کر ہماری خوشی کو برقرار رکھنا، لمحہ بہ لمحہ تخلیق کے مراحلے طے کرتے۔انتظار کی گھڑی گن گن کر وہ دن بھی قریب آ گیا۔جس کے انتظار میں 10 سالوں سے کر رہی تھی۔اس خوشی کو پانے کے لیے محسن جو روزگار کے سلسلے میں بیرونِ ملک مقیم تھے۔ اس سال وہ بھی وہاں گئے تھے۔ پیسہ تو آنے جانے کی چیز ہے۔اس خوشی کے لمحے کو میں نزدیک سے دیکھ کے محسوس کرنا چاہتا ہوں۔جب ندا کی تکلیف میں اضافہ ہوا تو سب کے لبوں پر زچہ بچہ دونوں کی خیریت کی دُعا تھی۔۔۔تکلیف تھی کہ لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی اور خوشی کی کوئی علامت بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی تو سب ہکا بکا ہونے لگے۔گاؤں میں کوئی ہسپتال بھی نہیں تھا جہاں یہ کیس کے لیے جاتے، محسن کے ساتھ باقی مردوں نے بھی دھوپ کر کے ایک گاڑی کا انتظام کیا اور تین گھنٹے کی مسافت پر ہسپتال تھا وہاں ندا کو لے جایا گیا۔تین گھنٹے طے کر کے جب وہ ہسپتال پہنچے تو، وہاں پر ڈاکٹر دستیاب نہیں تھا۔۔۔ندا ہوش کھونے لگی تھی اس کے عزیزوں کا الگ رنگ اڑا ہوا تھا۔ان کو لگ رہا تھا کہ اب وہ زچہ بچہ دونوں کو کھونے والے ہیں۔خدا خدا کر کے ڈاکٹر کو برآمد کیا محسن ڈاکٹر کو اندر ڈیلیوری روم میں لے گیا اور گھر والے دروازے سے لگ کر اپنے رب کی رحمت کو پکارنے لگے۔۔۔ایک گھنٹے کی مزید جان لیوا انتظار کے بعد ڈاکٹر کی بات نے ان سب کی دھڑکتے دلوں کو ساکت کر دیا تھا ہم نے زچہ کو

بچالیا ہے لیکن بچے کو بچا نہیں سکے، وہ ماں کے پیٹ میں ہی مر چکا تھا۔ یہ سن کر محسن کو لگا کہ اس کا سانس رک گیا ہے۔

شفٹ کیا تو وہ ٹوٹے قدموں سے ندا کی طرف بڑھا، محسن کو دیکھ کر ندا اپنا صبر کھو بیٹھی اور بلک بلک کر روتے ہوئے کہنے لگی۔ دیکھو محسن جس کے لیے ہم نے برسوں انتظار، کیا اور 9 ماہ میں نے اپنا خون پلا کے محبت نچھاور کر کے جیسے روح وجسم کو سینچا، وہ پانی کا بلبلہ ثابت ہوا دیکھو محسن وہ ہماری برسوں سے جمع کی ہوئی محبت دیکھے بغیر چلا گیا۔ وہ میری جسم وجان کو ویران کر گیا ندا کا سسکتا وجود باہوں میں بھر کے محسن کے آنسو بھی مسلسل بہنے لگے۔۔۔

❖❖❖❖❖

بے زبان

آج کل امی کو اچانک بیٹھے بیٹھے چکر آتے تھے اور وہ کہتیں اس دوران مجھے کچھ نظر نہیں آتا، میں اس وقت پانچویں کلاس میں پڑھتی تھی اور امی کے ساتھ گھر میں ہوتی تھی، باقی بہنیں اپنے گھر کی ہو چکی تھی اور ایک بھائی شہر مزدوری کے لیے گیا ہوا تھا۔ دوسرا بھی اپنی نوکری میں مصروف تھا۔ ابو کی جاب بھی شہر میں تھی یوں گھر میں صرف میں اور امی ہوتیں تھی۔۔۔صبح میں اسکول جاتی اور امی گھر کے کاموں کے ساتھ ساتھ کھیتوں میں بھی کام کرتی تھیں۔لیکن اب امی بیمار رہنے لگیں تو مجھے بہت تشویش رہتی، ہر وقت دھیان امی کی طرف لگا رہتا پڑھنے میں بھی دل نہیں لگتا تھا، ہر وقت اللہ سے امی کی زندگی کی بھیک مانگتی رہتی، اس طرح ایک مہینہ گزر گیا ابو آئے تو واپسی پہ مجھے اور امی کو شہر لے گئے۔ابو نے امی کو ڈاکٹر کو دکھایا، یہاں کے ڈاکٹر ز نے چیک اپ کے بعد ابو سے کہا آپ اپنی بیوی کو اسلام آباد لے جائیں وہاں کسی اچھے سے ڈاکٹر سے چیک اپ کروائیں، ابو ڈر گئے اور ڈاکٹر سے پوچھا ڈاکٹر صاحب کیا ہوا ہے؟ انہیں کوئی بڑا مسلئہ تو نہیں؟ ڈاکٹر نے ابو کو تسلی دی نہیں نہیں بس تسلی کے لیے ایسا کہہ رہا ہوں تو ابو تھوڑا مطمئن ہو گئے اور امی کو لے کے اسلام آباد چلے گئے۔۔۔وہاں چیک اپ کروانے پر پتہ چلا کہ امی کو برین ٹیومر ہے یہ سن کے ابو کے قدموں کے نیچے سے زمین نکل گئی، انہوں نے مجھے نہیں بتایا، ابو نے پیسہ پانی کی طرح بہایا لیکن امی جانبر نہ ہو سکیں، یوں امی ہم سب کو روتا بلکتا چھوڑ کر اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئیں۔امی کا جانا کوئی معمولی بات تو ہے نہیں جب ماں جاتی ہے تو پوری کائنات ساتھ لے جاتی ہے ماں تو وہ چھاؤں ہے جو خود پر، ہر ستم سہہ کر بچوں کو خوشیاں دیتی ہے ممتا کی چھاؤں ساتھ ہو تو بچے کو دنیا کے غموں کا بھی پتہ ہی نہیں چلتا لیکن ماں کے بغیر ٹھوکریں بچوں کا مقدر بن جاتی ہیں۔

ماں کے بعد میں بھی مستقل ابو کے پاس رہنے لگی اور یہاں اسکول جانا شروع کیا رات

ہوتی تو بستر میں منہ چھپا کیماں کو یاد کرتی اور دن کو اسکول اور گھر کے کاموں میں خود کو مصروف رکھتی، یہاں میں اور ابو ہی تھے ابو بھی مجھ پر بہت توجہ دیتے، میری خوشیوں کا خیال رکھتے، مجھ سے سکول کے بارے میں پوچھتے، میرے لیے چیزیں لاتے اور امی کے دکھ کے باوجود میں خود کو بہت امیر سمجھتی لیکن میں تھی بے زبان میں نے آج کچھ نہ بولا چاہے مجھے دکھ ملتے یا سکھ میں کبھی کوئی گلہ نہیں کیا، کیوں کہ میں یہی سوچتی میرے ابو مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔

بہن بھائی تو دُور تھے۔کبھی کبھار یاد کرتے،سب اپنے اپنے بچوں کے ساتھ خوش تھے۔۔ ایک میں اور ابو تھے جو ایک دوسرے سے اپنے آنسو چھپائے ایک دوسرے کو خوش رکھنے کی کوشش میں مصروف رہتے، دکھ تکلیف سے بھی گزرنا پڑتا تھا سو رفتہ رفتہ دکھ ہم سے بہت دور ہو گئے , اور زندگی بھی معمول کی طرف پلٹنے لگی۔ ایک دم سے وقت نے پلٹا کھایا اور رشتہ داروں کو میرے ابا کا اکیلا پن کھانے لگا،سب ابو کو مشورہ دیتے آپ دوسری شادی کر لیں۔ یوں ابھی سے آپ کا اکیلا رہنا اچھا نہیں ہے حالانکہ ابو کے دو جوان بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں۔ یہ سب سن کر مجھے بہت غصہ آتا اور رات رو رو کے گزار دیتی ابو سے تو کچھ نہیں کہہ سکتی تھی احتراماً خیال رکھتی،لیکن دل میں سمجھانے والوں کو بھی برا بھلا کہہ دیتی،ایک دن ابو نے ہم سب بہن بھائیوں کو اکٹھا کر کے مشورہ کیا کہ آپ لوگ کیا کہتے ہو اس گھر کو مجھے ایک عورت کی ضرورت ہے۔ جو اس گھر کو سنبھال سکے۔اگر آپ لوگوں کی اجازت ہو تو میں کر لیتا ہوں شادی،سب نے ہاں میں جواب دیا۔ میں بہت چھوٹی تھی اس لئے مجھ سے تو پوچھا ہی نہیں گیا۔اب میں فسٹ ایئر کی طالبہ تھی،اچھا برا سمجھنے کی صلاحیت رکھتی تھی اور وہ یہ تھا کہ ابو کو دیکھ بھال کرنے کے لیے ایک عورت کی ضرورت تھیوہ عورت میری ماں پر سوتن بن کے بھی نہیں آ رہی تھی یہ تو مقدر میں لکھا ہوا تھا جسے ہر حال میں ہونا تھا۔اس کے باوجود میرا غصہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں تو کسی گنتی میں نہیں تھی۔سب سے چھوٹی جو تھی سو چپ چاپ رہی پھر رشتہ بھیجا گیا ایک طلاق یافتہ عورت کو میں دُعا کرتی رہی یا اللہ وہاں سے انکار میں جواب آئے لیکن یہاں بھی اللہ نے میری دُعا قبول نہ کی۔۔۔ان کے ہاں سے جواب ہاں میں آیا پھر کسی اچھے دن گاؤں سے

سب رشتہ داروں کو بلایا اور دھوم دھام سے سارا امی ہماری زندگی میں شامل ہوگئی۔۔۔اور نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے سارا کو امی ماننا پڑا، سارا امی بھی ابو کے ساتھ میرا تھوڑا بہت خیال رکھتی، بس کھانے وغیرہ میں باقی کپڑے وغیرہ میں خود دھو لیتی، امی کسی دوسرے گاؤں سے تھیں تو ان کی ایک عادت مجھے بہت بری لگتی تھی کوئی بھی شہر آتا تو ہمارے گھر رہنے آجاتا تو میرا خون کھولنے لگ جاتا تھا۔آج ان لوگوں نے امی کے گاؤں جانا تھا امی مجھ سے کہنے لگی، مومینہ تم بھی چلو ہمارے ساتھ تو میں غصہ کو چھپا کے بولی، اچھا آپ کے ساتھ جاؤں، پڑھائی چھوڑ کے؟ میں کیوں جانے لگی آپ کے ساتھ؟ امی اپنا سا منہ لے کے رہ گئی اور آہستہ سے بولی، اس میں اتنی غصے والی کیا بات ہے۔ میں تو بس تمہارے یہاں اکیلے رہنے کی وجہ سے پوچھ رہی تھی۔۔۔پھر ابو اور امی چلے گئے اور میں گھر میں اکیلی رہی، مجھے لگ رہا تھا کتنے دنوں بعد میں آزادی کی سانس لے رہی ہوں، میں بہت خوشی سے ادھر ادھر گھوم پھر رہی تھی۔حالانکہ ان کے ہوتے ہوئے بھی مجھ پر کوئی پابندی نہیں تھی۔آج پھپھو کی کال آئی تو میں رونے لگی، پھپھو نے پوچھا کیا ہوا میری جان؟ کیا کسی نے کچھ کہا ہے؟ تمہارے ابو اور سارہ کدھر ہیں؟ میرے رونے سے گھبرا کر پھپھو نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے، وہ لوگ ادھر نہیں ہیں وہ لوگ امی کے گاؤں گئے ہوئے ہیں اچھا تمہیں یوں اکیلا چھوڑ کر؟ سارا تو غیر تھی لیکن تمہارے باپ کو تمہارا خیال کرنا چاہیے تھا۔پرائی عورت ایسی ہوتی ہے اسے کیا تم جیو یا مرو، تمہارے ابا کو آنے دو، میں خود ان سے بات کروں گی جوان جہان لڑکی کو یوں اکیلا چھوڑ کر، پھپھو اپنے دل کی بھڑاس نکال رہی تھیں اور میں چور بنے بیٹھی رہی اور پھپھو سے کہنے لگی آپ ابو سے کچھ مت کہنا بس اس بات کو چھوڑ دیں ورنہ ابا مجھ پر غصہ کریں گے۔تین دن بعد وہ لوگ واپس آگئے۔ پھر گھر کی وہی روٹین، کبھی ان کے گاؤں سے لوگوں کا ہجوم آتا تو کبھی ہم لوگ جاتے اس وقت لگتا کہ گھر میں کوئی نہیں ہے سب اکیلے ہیں۔ہاہاہا اس دوران امی کا ایک بیٹا ہوگیا۔بھائی لوگ کبھی کبھار میرا خرچ بھیج دیتے ورنہ ابا رو دھو کے خرچ پورا کرتے۔امی بھی پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔ابا کو ورغلاتی اور ابا کا عتاب مجھ غریب پر اترتا، میرا تو ابا کے علاوہ کوئی نہیں تھا اس لیے

چپ چاپ ہر ستم سہہ جاتی ہمیشہ سے بے زبان جو تھی اور میں نے خود سے وعدہ کیا تھا جب تک تعلیم مکمل نہیں ہو جاتی، ان سے کبھی نہیں، الجھنا ورنہ ابا جو تھوڑا خرچ دیتے ہیں اس سے بھی جاؤں گی اور سر چھپانے کو ایک چھت ہے وہ بھی چھن جائے گی حالات سے لڑتے لڑتے اللہ کے کرم سے میں یونیورسٹی پہنچ ہی گئی تھی۔جس کیخواب میں میری آنکھیں اور جسم بھی پتھر کی ہونے لگے تھے۔۔۔کبھی امی کا طعنہ کبھی ابو کا برسنا کبھی فیس نہ دینے کی دھمکی تو کبھی گھر سے نکال دینے کا نوٹس۔۔۔

آج یونیورسٹی میں میرا پہلا دن تھا میں نے اپنا پرانا لیکن کچھ بہتر حالت میں رکھا ہوا ایک سوٹ نکال کے استری کیا۔جوتے تیار کر کے رکھے، پھر صبح یونیورسٹی کے لیے روانہ ہوئی، یونیورسٹی میں بھی اپنی کچھ کلاس فیلو سے ملی ان کو یہاں ساتھ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔یورنیورسٹی جاتے ہوئے مجھے چار پانچ ماہ ہو چکے تھے آج میں بلتستان یونیورسٹی کی سبزہ زار میں بیٹھی ہوئی اپنی ہی سوچوں میں گم تھی کسی کی ہیلو کی آواز سن کر ہڑ بڑا کے میں نے ،نظر گھمائی تو سامنے ایک لڑکا کھڑا تھا جی کیا ہوا؟ مس ہوا کچھ نہیں ہے بس ہونے والا ہے وہ مسکراتے ہوئے کہنے لگا جی میں سمجھی نہیں کیا ہونے والا ہے؟ میں نے دوبارہ سوال کر ڈالا لیکن وہ ٹال گیا کچھ نہیں، بس کب سے میں دیکھ رہا تھا۔آپ ایک جگہ سے ہلی ہی نہیں تو دیکھنے آیا تھا کہ آپ زندہ انسان ہیں یا وہ بات ادھورا چھوڑ کر پھر مسکرایا اور میں اسے چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنی کلاس فیلو کو ڈھونڈنے نکلی، چھٹی کا بھی ٹائم ہو گیا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ کچھ دن بعد میری اس سے جان پہچان ہو گئی وہ مجھ سے ایک کلاس آگے تھا اور انجینئرنگ پڑھ رہا تھا۔اب ہم کبھی کبھار اس جگہ بیٹھ کر موسم اور حالات پر تبصرہ کرتے تھے۔یوں آہستہ آہستہ میں اور عمران ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے۔

صبح یونیورسٹی پہنچ کر نظر پہلے اسے ڈھونڈنے میں لگ جاتی تھی۔اب مجھے زندگی سے شکایت بھی کم ہونے لگی تھی۔زندگی ایک دم سے خوبصورت لگنے لگی تھی آبشاروں کا شور نغمے میں بدل گیا تھا۔ہوا کی سرسراہٹ کسی کی سرگوشی لگتی، بے اختیار دل سجدہ شکر میں جھک جاتا اور میں

خود کو دنیا کی حسین ترین لڑکی سمجھتی، خود کو کسی کی منظورِ نظر دیکھنا، ایک نعمت سے کم نہیں ہوتا، جس لڑکی نے دکھوں کے سوا کچھ نہ دیکھا ہو، محبت کا مزا چکھے نرم لفظوں سے ناطہ ٹوٹے برسوں گزر گئے تھے۔ اب اسے محبت سے آشنائی ملے تو کیا حالت ہوتی ہے، جینے کو دل چاہنے لگا تھا آئینے کو سہیلی بنا بیٹھی تھی۔ چلتی ہواؤں کو چہچہاتے پرندوں کو اپنا رازداں بنا بیٹھی تھی۔۔۔ کیونکہ انسانوں کو ایسا ویسا بنانے سے میں ڈرتی تھی۔۔۔ جب بہن، بھائی باپ اپنے نہیں ہوئے تو پھر غیر کیسے اپنے بنتے، ایک عمران تھا جس کو میں نے پورے خلوص سے اپنا دل سونپا تھا اس امید پر کہ وہ اسے ٹھیس نہیں پہنچائے گا، محبت، کی حسین رہ گزر پر چلتے چلتے ایک دن عمران نے مجھے پرپوز کرتے ہوئے کہا، مومینہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں تم کیا کہتی ہو؟ میں شرم سے پانی پانی ہونے لگی، لیکن دل بڑا کر کے کہا، آپ کی مرضی چاہے تو ہمارے گھر رشتہ بھیج دیں۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ کہنے لگا، دراصل مومینہ میں تمہارے گھر رشتہ نہیں بھیج سکتا؟ میں نے عمران، کو سوالیہ نظروں سے دیکھا، تو وہ کہنے لگا ہمارے گھر والے نہیں مان رہے ہیں بس تمہاری اور میری مسلک کی وجہ سے پھر آپ نے رشتے کی بات ہی کیوں کی؟ میں چاہتا ہوں ہم دونوں چھپ کے شادی کر لیں۔ اچھا میں چپ ہوگئی تو عمران پوچھنے لگا کچھ بتاؤ نہ تم کیا کہتی ہو۔ میں کبھی نہیں کہوں گی، مجھے اپنے باپ، بھائیوں کی عزت بہت عزیز ہے اس لیے آپ بھول جائیں۔ میں یہ شادی نہیں کروں گی، اسی تکرار پر بات رک گئی اور میں گھر آ گئی، ادھر سارا امی کے دو بچے ہو گئے تھے اور امی کے ساتھ اب ابو بھی بات بات پہ مجھے برا بھلا کہتیں اور مجھ پر ہاتھ اٹھانے کی کوشش بھی کرتیں، اس پر میرا سارا امی کے ساتھ جھگڑا ہوتا، میں امی سے کہتی آپ ابو کے کان بھرتی ہیں۔ آپ کو ہم بہن بھائی کھٹکتے ہیں۔ لیکن امی قسم کھاتی اور یقین دلاتی، میں ایسا کچھ نہیں کہتی ہوں، یہ سب تمہارے ذہن کا فطور ہے۔ اسی کشمکش میں میرا ایم بی اے کلیئر ہو گیا تھا اور میں بہت خوش تھی اللہ نے ایک چیز سے تو پورا نوازا الحمدللہ جس دن میرا ایم۔ بی۔ اے کلیئر ہوا میں خوشی خوشی گھر آئی، اس دن ابو میرے دیر سے آنے کا بہانہ کر کے بھرے بیٹھے تھے۔ جیسے ہی میں گھر میں داخل ہوئی ابو برسنا شروع ہو گئے، میں چپ چاپ اپنے

کمرے میں چلی گئی ،لیکن ابو کمرے میں آ گئے مجھ پر تھوکا اور کہا میں تمہیں اپنے گھر میں نہیں رکھوں گا جدھر مرضی چلی جاؤ،اب تک میں نے تمہیں بہت برداشت کیا ہے یہ میری ہمت ہے۔لیکن اب تم کو ایک سیکنڈ بھی اپنے گھر میں برداشت نہیں کر سکتا۔میں روتے ہوئے کہنے لگی ابو میں کدھر جاؤں گی میرا آپ کے سوا کون ہے؟جس کے پاس میں جاؤں،تو جاؤ نا اسی عمران کے پاس،ابو زور سے چلائے۔ابو ایسا مت کریں۔میں ہکا بقا ہو کے سوچنے لگی،ابو کو میرے عمران کے بارے میں کیسے پتہ۔۔۔پھر ہمت جمع کر بول پڑی،امی نے اللہ کی مرضی سے ہمیں بے آسرا کیا ہے،اب آپ اپنے ہوتے ہوئے مجھے سڑک پر مت پھینکیں۔ابو خدا کے لیے، لیکن ابو نے میری ایک نہیں مانی اور میرا ہاتھ پکڑ کر گھر سے باہر نکال دیا،اس ظلم پر میری زبان گنگ ہوگئی اور میں چپ کے چپ رہ گئی۔۔۔جیسے میری آنسو ختم ہو گئے۔کسی رحم دل انسان نے چند دن مجھے اپنے گھر میں رکھا،پھر میں کسی کے گھر میں ایک کمرا کرایہ پہ لے کے رہنے لگی۔اب میں اور میری تنہائی تھی۔میں نے ایک دن عمران کو فون کر کے پوچھا کہ تم بتایا ہے میرے ابو کو میرے اور اپنے بارے میں تو وہ شرمندہ ہوا۔ہاں موبینہ میں گیا تھا تمہارے گھر مگر تمہارے لئے مگر تمہارے ابو نے مجھے بے عزت کر کے گھر سے نکال دیا۔لیکن تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟انہوں نے میرے کردار پہ شک کیا ہے۔میں نے روتے ہوئے فون بند کر دیا۔ ان سب پر میں نے صبر کیا تھا اس صبر کا پھل اللہ نے مجھے ایک بہترین جاب کی صورت میں دیا، آج میں اس سیٹ پر ہوں تو اپنی صبر کی وجہ سے اور شکر کی وجہ سے میں نے کسی سے کوئی شکایت نہیں کیا۔شکوہ نہیں کیا۔ہمیشہ بے زبان ہی رہی تھی۔

❖❖❖❖❖

رمضان

رمضان المبارک کی آمد آمد ہے اس سوچ کے ساتھ ہی دل میں سرورسی آجاتی ہے برکتوں، رحمتوں، کا یہ مہینہ عالم اس ''لام'' کے لیے اللہ کا ایک خوبصورت تحفہ ہے خوش نصیب ہیں وہ انسان جو اس مہینے میں روزے کے ساتھ نماز، تلاوت، نوافل، کا اہتمام کرتے ہیں۔ساتھ میں صاحب استطاعت لوگ غریبوں، مسکینوں کی مدد کر کے اس مبارک مہینے رحمتوں کا دوبالا کرتے ہیں تاکہ کوئی مسلمان بھائی بھوکے پیاسے نہ رہ جائیں، کسی گھر میں تو انواع اقسام کے کھانے پکے اور کسی گھر میں اس کا دینی بھائی چولہا بھی نہ جلا سکے، لیکن ایک دو سالوں سے چولہی جلانا اور وہ بھی رمضان میں مشکل ہوتا جا رہا ہے۔مہنگائی نے جہاں ہر چیز کو متاثر کیا ہے وہاں رمضان المبارک کے دنوں کی رونقیں بھی کم کر دی ہے۔

مومینہ اور عرفان کے تین بچے ہیں۔ان کا تعلق ایک متوسط گھرانے سے ہے مومنہ بہت سلیقہ شعار خاتون ہیں اس وجہ سے انہیں گھر چلانے میں زیادہ مشکلات کا سامنا نہیں ہوتی تھی اور وہ خرچوں سے کچھ بچا کے رمضان میں کئی گھروں میں مدد بھی کرتی تھیں۔اب بھی رمضان کی آمد آمد تھی تو وہ اسی بارے میں سوچ رہی تھی عرفان کی آمد پر اس کی سوچوں کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔بیگم صاحبہ کیا سوچ رہی ہے؟ کافی دیر سے دیکھ رہی ہوں آپ سوچوں میں اتنی غرق ہے اردگرد کا ہوش بھی نہیں ہے۔کیا کوئی مسئلہ ہے؟

نہیں تو پھر؟ رمضان کی نزدیک ہے نہ اس بارے میں سوچ رہی تھی پہلے ہی لوگوں کی زندگی مشکل ہے اب رمضان میں اور مشکل ہوگی اس مہنگائی کے اژدھام میں اور کچھ ہم نے اپنے طرز زندگی کو خود بھی مشکل بنایا ہے۔جہاں ہمارا دین ہمیں سادگی کا تعلیم دیتا ہے ہم نے دین کو تو اپنایا ہے لیکن اس کی لوازمات کو چھوڑ دیا ہے، ہم پیغمبر خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی امتی ہونے کا دعویٰ تو کرتے ہیں لیکن ان کی طرز زندگی کو اپناتے ہوئے ہمیں اپنے سٹیٹس کا فکر

لاحق ہوتی ہے۔کہیں لوگ ہمیں غریب نہ سمجھے ہمیں مذاق کا نشانہ نہ بنادے۔اگر ہمارے پاس دس جوڑا کپڑا نہ ہوتو کیسے جی لیں گے۔ ہمارے بچے مہنگے سکولوں میں نہ پڑھ سکے تو ہم لوگوں کو کیا بتائیں گے۔

ہماری لڑکیوں کے پاس سونا نہ ہوتو ان کو کون بیاہ کے لے جائیں گے۔بیگم صاحبہ ان باتوں کوسوچ کر خود کو دکھی نا کرتی رہا کرو، اپنا سوچو، ہم اپنی استطاعت کے مطابق جو ہوسکے وہ کروں گے۔ ہم اپنی پیٹ کاٹ کر کسی کے بجھے ہوئے چولہے کو جلانے کی کوشش کریں گے۔ باقی اللہ مالک ہے مومنہ نے عرفان کی بات کاٹ دی اور بولی، جی ہاں ہماریاسی یہی خود غرضی ہمیں کہیں کانہیں چھوڑتا، آپ کہیں گے اپنا سوچو، دوسروں کے دکھ درد سے ہمیں کیا لینا دینا دوسرا شخص بھی یہی کہیں گے۔اس طرح سب اپنا اپنا سوچیں گے تو بہتر معاشرے کیسے وجود میں آئیں گے؟ معاشرے میں لوگوں میں ملک میں بہتر تبدیلی یا انقلاب کیسے آئیں گے؟ کوئی کہے کوئی چلے اور ساتھ میں شامل ہوتے جائے تو قافلہ بنے گی نہ پھر تبدیلی عمل میں آئی گی، سوچ بدلیں گے۔ ملک بدلیں گے۔ترقی ہوگی، پھر او کے بیگم صاحبہ آپ کہاں سے کہاں سے پہنچ جاتا ہے آپ کو بھی سیاسیات میں ہونا چاہیے ہے یہ سب کرنے کے لیے اس کا کوئی امکان نہیں ہے۔سوایسا کرو، جو ہماری استطاعت میں ہے ہم اسی حساب سے ان شاءاللہ مدد کریں گے۔

ٹھیک ہے آپ صحیح کہہ رہا ہے، پر کیا کروں یہ سب دیکھ کر دل دکھ جاتی ہیں جو بات دل میں ہوتی ہیں وہ زبان پر آجاتی ہے۔مگر آپ صحیح کہہ رہا ہے عرفان، میں نے کچھ مہینوں سے رمضان کے لیے بچت کر رہی تھی تا کہ تین چار ہی ہو، چند گھروں میں تھوڑا راشن ڈال سکوں اس میں تھوڑا آپ بھی ملالیں تا کہ محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی امتی ہونے کا کچھ حق تو ادا کر سکوں، ان کی نقش قدم پر دور تک نہ سہی چند قدم چلنے کی توفیق تو ملے۔ان شاءاللہ ضرور اللہ ہر انسان کو اس مہینے کی سعادتیں حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔آمین

❖❖❖❖❖

رنگ بدلے زندگی

ان کے جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا تین دن سے ہسپتال میں ایڈمٹ تھے۔ان کی حالت دیکھ کر سب کی جان پر بنی ہوئی تھی اور آج ان کا ٹھیک ہو کے گھر آنا یہ کہنا مناسب ہوگا کہ آنہیں گئے بلکہ لایا گیا تھا۔۔۔کیونکہ چوہدری ذیشان کے جسم میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ چل کے آتے، جب چوہدری نثار بیٹے کو گھر لے آئے تو گھر والوں نے ان کا استقبال پھولوں سے کیا تھا۔۔۔اور انہیں بہت احتیاط سے لا کے بیڈ پر سلا دیا،ان سب کاموں میں چوہدری نثار پیش پیش تھے۔ان کو ذیشان سے بہت پیار تھا دوسرا ان کی حالت نے انہیں جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ چھوٹے بڑے سب چوہدری ذیشان کے ارد گرد کھڑے سوال پر سوال کر رہے تھے۔۔۔لیکن ابھی وہ کسی بھی سوال کا جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔یہ دیکھتے ہوئے چوہدری نثار نے سب کو ڈانٹ دیا، کیا دیکھ نہیں رہے ہو اس کی حالت؟ سوال کسی اور وقت بھی پوچھے جا سکتے ہیں۔ابھی اس کو آرام کرنے دو، یہ کہہ کے انہوں نے سب پر ایک نظر ڈالی تو سب ایک ایک کر کے کمرے سے نکل گئے۔۔۔اور چوہدری نثار ذیشان کے پاس ہی رہے۔وہ ایک لمحہ کے لیے بھی بیٹے سے الگ نہیں ہو رہے تھے۔۔۔سب کی محنت اور محبت تھی کچھ ہی دن میں چوہدری ذیشان، بہتر محسوس کر رہے تھے ورنہ اُن لوگوں نے مارنے کی کوئی کسر ہی نہیں چھوڑی تھی۔۔۔ انہوں نے آنکھ کھول کے اپنے ارد گرد دیکھا اور یہ دیکھ کر وہ اپنے گھر میں ہیں اپنے کمرے میں ہیں ایک پر سکون سانس لیا اور آٹھ کے بیٹھ گئے۔دائیں طرف امی اور بائیں طرف ابو بیٹھے ہوئے تھے۔امی نے آگے بڑھ کر ان کا سر اپنی گود میں رکھ لیا، بیٹے کی تکلیف پر بے وہ بے اختیار رو دی، چوہدری ذیشان ماں کو تسلی دینے لگے،امی روتی کیوں ہیں؟ میں زندہ سلامت آپ کے سامنے ہوں، امی کہنے لگی، بیٹا میں ان ظلموں کے ظلم پر رو رہی ہوں جو اس وقت پاکستان میں انہوں نے ہر شہری پر مچا رکھی ہے یہ تیری میری بات نہیں ہے اب ہر دوسرا گھرانہ

اس ظلم کا شکار ہے۔۔۔

امی فکر مت کریں، ان شاء اللہ یہ ظلم چھٹ جائے گا اور حق کا بول بالا ہو گا، ماں باپ بیٹا یک زبان ہو کر بولے ان شاء اللہ۔

آج رات کو چوہدری نثار بیٹے کو بہتر حالت میں دیکھ کر اپنے کمرے میں سونے گئے تھے، ورنہ وہ کئی دنوں سے ادھر ہی سو رہے تھے۔ آج طبیعت کچھ بہتر تھی اور چوہدری ذیشان کو کمرے میں بیٹھے بیٹھے گھٹن کا احساس ہونے لگا، کئی دن سے وہ گھر والوں کے سخت پہرے میں تھے آج رات سب اپنے اپنے کمروں میں گئے، تو رات کو وہ آہستہ آہستہ کمرے سے نکل کر لان میں آ گئے جنوری کی ٹھرٹھراتی سردی نے ان کا استقبال کیا۔ لیکن وہ پہلے سے ہی بچاؤ کا بندوست کیے ہوئے تھے۔ اس لئے تھوڑی سی واک کے بعد ایک آرام دہ کرسی پر بیٹھ گئے۔ آنکھ بند کی تو ماضی کی کتاب کا ورق در ورق میرے سامنے کھلتا گیا اور میں جی سی یونیورسٹی لاہور میں پہنچا، جہاں میرا اور میرے دوستوں کی غنڈہ گردی کی داستان ہر زبان پر عام رہتی تھی۔ ایک تو چوہدری کا خون اس پہ جوانی اور اللہ نے چوہدری ذیشان کو حسن کی دولت سے بھی خوب نوازا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بہت مغرور ہوا کرتے تھے کسی کو بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ یونیورسٹی میں ہم سے پروفیسر بھی دب کے رہتے اور ہم اپنی ہی من مانی میں رہتے یونیورسٹی میں بہت سی لڑکیوں سے دوستی بھی تھی اور بہت کو میں نظر انداز بھی کرتا، لیکن پہلی نظر میں ہی اس لڑکی کو میں نظر انداز نہ کر سکا، جو اپنی دوستوں کے ساتھ کیفے، کی طرف جا رہی تھی۔ میری نظروں نے دور تک اس کا پیچھا کیا تھا اور ایک دن اس سے اظہارِ محبت بھی کر بیٹھا جب تعارف ہوا تو پتہ چلا ہما ہمارے ساتھ والے گاؤں کے چوہدری کی بیٹی ہے جن کے ساتھ ہماری تین نسلوں سے دشمنی چلتی آ رہی تھی۔۔۔ لیکن محبت یہ سب کہاں دیکھتی ہے جب کرنے پر آتی ہے تو اپنا آپ منوا کے رہتی ہے سو ہم دونوں بھی نتائج سے بے پروا ہو کر اس راہ پر قدم رکھ بیٹھے۔ جس کی منزل ہمیشہ بے نشاں رہتی تھی۔ ہما سے محبت کیا ہوئی تھی، میں ہواؤں میں اڑنے لگا تھا۔ دنیا اس سے پہلے کبھی حسین نہیں لگی تھی۔ گھٹ گھٹ کے رہنا، مخالف پارٹی کو کیسے، ہرانا ہے۔ گولی کہاں اور کس

پر چلانے ہے؟ کبھی باپ , چچا سے ڈانٹ پڑھنے کا ڈر تو کبھی ماں کی جھڑکیوں سے خوفلیکن محبت نامی چیز نے یہ سب بھلا دیا تھا۔۔۔اور یاد تھی تو صرف ہما کی حسین اور دل فریب مسکراہٹ اور ہما کو حاصل کرنے کے لیے میں دشمن سے ٹکرانے کو بھی تیار تھا ہما مجھ سے کہتی، ذیشان محبت تو ہم کر بیٹھے ہیں۔لیکن ہمارا ملنا مشکل نہیں بلکہ ناممکن ہے اور میں اس کو تسلی دیتا،فکر مت کرو تم میں اپنے گھر والوں کو منا لوگا اور ہم، تین نسلوں پر محیط اس دشمنی کو اس مظبوط رشتے میں باندھ کر ہمیشہ کے لیے ختم کریں گے ان شاء اللہ۔

ہما کہنے لگتی، پتہ نہیں یہ خواب خواب ہی نہ رہے۔ پلیز ہما تھوڑی دیر کے لیے اس خوف کو ہمارے درمیان نہ لاؤ، ان، خوش کن لمحات کو محسوس کرنے دو۔آئندہ کے خوف میں ابھی کی خوشی کو برباد تو نا کریں وہ مسکرانے لگی اور ہما کو مستقبل کے خواب بنتے یونیورسٹی کے دو سال پلک جھپکتے گزر گئے۔۔۔

جب والدین نے میری شادی کا موضوع چھیڑا تو میں نے ڈرتے ڈرتے ہما کا نام بتا دیا، پہلے والدین مجھ سے بہت ناراض ہوئے ایسا نہیں ہوسکتا کیسے ہم ایک دشمن سے رشتہ جوڑ سکتے ہیں؟ ہم ان کے گھر رشتہ لے کر جائیں۔ یہ ہماری انا کیسے گوارا کرے گی، لیکن میری حالت کے آگے ان کی ایک نا چلی، میرے گھر والوں نے ان کے گھر رشتے کا پیغام بھیج دیا، مگر چوہدری سرور کسی صورت ماننے کو تیار نہیں تھے۔ میں اور ہما کی معصوم محبت بھی دشمنی کی بھینٹ چڑھ گئی کیونکہ محبت کو ازل سے قتل کرتے آئے ہیں اور کبھی بھی کسی نے بھی عدالت میں یہ مقدمہ نہیں جیتا تھا۔۔۔

امی کہنے لگی، بیٹا اب تم شادی کرلو میں کوئی لڑکی دیکھ لوں اب تمہاری شادی کی عمر ہے۔نہیں امی میں نے اب کبھی شادی نہیں کرنی، آپ باقی بہن بھائیوں کی شادی کر دیں۔۔۔

ابھی میں نے پڑھنا ہے آگے ان شاء اللہ وکالت پڑھوں گا آئے دن ہمارا سیاست سے تعلق ہے تو گھر میں ایک وکیل کا ہونا ضروری ہے۔ میں نے امی کی بات پر بات کو مزاحیہ رنگ دیتے ہوئے ایک زخمی مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو امی چپ ہوگئی میری وکالت پڑھنے کے دوران

جب چھٹی کے دن شہر سے گاؤں جاتے ہوئے مجھ پر ایک قاتلانہ حملہ ہوا تھا تو میں شدید زخمی ہوا تھا اس کی وجہ سے میں کومے میں چلا گیا تھا 45 دن بعد مجھے ہوش آیا، شاید اللہ نے ابھی مجھے زندہ رکھنا تھا۔ میں ہوش کی دنیا میں واپس آیا تو اس دشمنِ جاں کا ایک کارڈ میرا منتظر تھا۔ میرے صحت یابی کی دُعا کے ساتھ اپنے شادی کی خبر بھی دی تھی ایک لمحہ کے لیے دنیا میرے نظروں میں تاریک ہوگئی تھی۔ دوسرے لمحے میں نے خود کو سنبھال لیا، اب اللہ کے کرم سے میں بالکل صحت یاب ہوگیا تھا اور میں نے وکالت کی تعلیم مکمل کر لی تھی۔۔۔

اس دوران میرے بھائیوں اور بہنوں کی شادی ہوگئی اور سب خوشحال زندگی گزار رہے تھے۔ میں بھی ابو، تایا اور چچا کے ساتھ دشمنوں سے دشمنی بھی نبھاتا اور جرگا بھی دیکھتا تھا اس کے ساتھ ساتھ بہت سی برائیاں جو چوہدریوں کا خاصہ تھیں مجھ میں بہ درجہ اتم موجود ہیں۔ میں سفاک بھی مشہور تھا۔ ان سب کے ساتھ میں نے وکالت کی پریکٹس بھی جاری رکھی، اللہ کی فضل سے میری محنت رنگ لے آئی، جو بھی کیس میں ہاتھ میں لیتا جیت جاتا، آہستہ آہستہ میری شہرت بڑھ گئی، اب جو کیس میں ہاتھ میں لیتا تھا وہ جیت کی ضمانت بن جاتا۔ یہ مجھ پر میرے رب کا خاص کرم تھا میں کیس پر محنت بھی زیادہ کرتا تھا، ایک کیس جو میں بھول نہیں سکا قتل کا تھا جس پر قتل کا الزام تھا وہ بیگناہ تھا لیکن پھنسانے والوں نے اسے بری طرح پھنسایا تھا۔ اس پر مجھے محنت بھی بہت کرنا پڑی اور میں اسے بری کروانے میں کامیاب بھی ہوگیا، اس کی خوشی مجھے آج بھی خوش کرتی ہے۔۔۔

ان چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو کبھی کبھار محسوس کریں تو دل پرسکون سا ہو جاتا ہے کیونکہ دشمنوں سے لڑتے سیاست کی گہما گہمی میں غرق دنیا کو حاصل کرنے کی دھن میں ہم انسان خود کو کہیں پیچھے چھوڑ دیتے ہیں اور اپنے محسوسات پر پردہ ڈالتے چلے جاتے ہیں۔ پھر بندہ انسان سے مشین بن جاتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ کبھی خود کو ان چھوٹی چھوٹی خوشیوں میں تلاش کریں یقین جانیے نقصان نہیں ہوگا۔۔۔۔

میں اپنی برائیوں کے ساتھ نا جانے کب تک جیتا اور اپنا خسارہ کرتا رہتا، ایک دن ابو مجھے

ایک ایسے نیک شخص کے پاس لے گئے انہوں نے مجھے پر کچھ ایسا کرم کیا میں نے سب برائیوں کو چھوڑ دیا، ساتھ خود سے عہد کیا تھا کوئی ایسا کام کروں گا، جو مجھے خدا سے باندھ کے رکھے اور مخلوق خدا کی خدمت کا شرف بخشے۔ جب میں نے یہ ارادہ کیا تو اللہ نے یہ بات بھی میرے دل میں ڈالی کہ میں ایک یتیم خانہ کھولوں، تاکہ بے سہارا بچوں کی پرورش ہو سکے۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے اپنے ابو سے مشورہ کر کے نیک کام میں دیر کیسی ایک یتیم خانہ کھول لیا، اس میں اللہ کے فضل سے 300 بچوں کی کفالت کے ساتھ 55 ملازمین کو تنخواہ بھی دیتے ہیں یہ میرا کمال نہیں میرے اللہ کا کرم ہے۔۔۔ بنتی بگڑتی تقدیر کے باوجود خود کو حالات کے حوالے کرنے کے باوجود کبھی کبھی دل کی کسک بے چین کر دیتی ہے۔ بہن بھائی ہماسب نے اپنی اپنی منزل پالی، اپنے بچوں کے ساتھ خوش وخرم زندگی، گزار رہے ہیں۔ ایک میرے ہی حصے میں تشنگی آئی لیکن کچھ مہینوں سے مجھے لگتا ہے میری قسمت اتنی بری نہیں جتنی میں نے سوچی تھی۔ جب سے قندیل میری زندگی میں آئی تھی۔ وہ بہار کا جھونکا ثابت ہوئی تھی۔ میرا بھیجنے کو دل کرتا ہے زندگی کی گہما گہمی میں دل سے شامل ہونے اور انجوائے کرنے کو دل کرتا ہے۔ جس دل کو میں نے اتنے دکھ اور تکلیفوں کے بعد مردہ سمجھ لیا تھا۔ اب وہ پھر سے دھڑکنا چاہتا ہے۔ دنیا سے خوشی کشید کرنا چاہتا ہے۔ شاید چوہدری ذیشان ماضی کی بھول بھلیوں سے نکل کر حال اور مستقبل میں جینا چاہتا ہے یہ سب اس ایک لڑکی کی مرہونِ منت ہے۔ جس کے خلوص اور سادگی نے چوہدری ذیشان کو باندھ دیا ہے۔ چوہدری ذیشان جس کے نام سے لوگ ڈرتے ہیں۔ وہ خود ایک لڑکی سے ہار گئے ہیں۔ پھر بھی یہ ہار مجھے خوشی دیتی ہے یہ سب سوچتے سوچتے اذان کی آواز پر چوہدری ذیشان نے آنکھ کھولی اور چونک گئے۔۔۔ ماضی کی بھول بھلیوں میں گھومتے حال کی خوش کن لمحات کو سوچتے پتہ ہی نہیں چلا تھا رات بیت گئی ہے اور صبح صادق طلوع ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ درد بھی ٹیس دینے لگا کے تحت اٹھوایا کے چار دن تشدد کا نشانہ omp تھا مخالف پارٹی کے ورکر ہونے کی جرم میں تین دن پہلے پولس نے 3 بنایا تھا لیکن وہ اپنے موقف پر ڈٹا رہا تھا اور چوہدری نثار نے بیٹے کو نیم بے ہوشی کے عالم میں عدالت سے

ہسپتال پہچایا تھا۔۔۔سارے دردوں نے مل کر چوہدری ذیشان کے آنکھوں کو نم کر دیا تھا۔لیکن دوسرے لمحے قندیل کا خیال آتے ہی ایک خوبصورت مسکراہٹ نے چوہدری ذیشان کے چہرے کو روشن کر دیا تھا ساتھ ایک پرسکون سانس بھی لیا،زندگی اب اگلی منزل کی جانب سفر کر رہی تھی اور یقیناً آگے کی سفر خوشیوں کے ہی ہوں گے،سوچتے چوہدری ذیشان نے کمرے کی جانب قدم بڑھائے۔۔۔

❖❖❖❖❖

پردیس

عاصمہ کافی دنوں سے نوٹ کر رہی تھی عمران کو بیٹھے بیٹھے کسی گہری سوچ میں گم ہو جاتے آج اس سے رہا نہیں گیا تو پوچھ بیٹھی، عمران ہاں بولو میں کافی دنوں سے آپ کو کسی گہری سوچ میں دیکھ رہی ہوں، کیا سوچا جا رہا ہے؟ خیریت ہے! عاصمہ میں سوچ رہا ہوں، کیوں نہ باہر جاؤں، اب بچے بڑے ہو رہے ہیں اس کے ساتھ ان کو پڑھانے کے لیے شہر بھیجنے کا ارادہ ہے تو خرچہ بھی زیادہ آئے گا۔ میں خود نہیں پڑھ سکا لیکن میں اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم یافتہ دیکھنا چاہتا ہوں، اس کے لیے بہت محنت کی ضرورت ہے میں یہاں جو کماتا ہوں وہ تو ہمارے کھانے پینے میں چلا جاتا ہے۔ تم کیا کہتی ہو؟ میں! مجھے آپ کا یہ فیصلہ پسند نہیں آیا، کیوں؟ اس میں کیا خرابی ہے؟ ایک تو اتنی دُور دوسرا، سب لوگ ادھر ہی رہ کے مزدوری کر کے گھر بھی چلاتے ہیں اور بچوں کو بھی تعلیم دے رہے ہیں۔ ہم ان سے الگ نہیں ہیں بچے خود پڑھنا چاہے تو اسی میں بھی گزارا ہو جائے گا، اچھا! مگر میں نے فیصلہ کیا ہے بچوں کی خاطر جو بھی کرنا پڑا کریں گے۔ ٹھیک ہے پھر آپ کی مرضی میں کون ہوتی ہوں، آپ کو منع کرنے والی، عاصمہ کچھ ناراضی سے کہتے ہوئی اٹھ گئی اور عمران نے بھی اپنی سوچ کو عملی جامہ پہنانے کا عزم لے کر گھر سے باہر چلا گیا۔

بھائی وغیرہ سے مشورہ کر کے انہوں نے سعودی عرب کے لیے اپلائی کیا۔ وہ یہاں ڈرائیور تھا۔ اس کے پاس ہنر تھا سو اسنے آگے بھی اسی کو کام میں لانے کا پلان بنایا، 6 ماہ بعد سعودیہ کا ویزہ اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ بہت خوش تھا۔ اللہ نے اس کی دُعا سن لی تھی۔ اسے سعودیہ جیسی مقدس جگہ کا ویزہ مل گیا تھا۔ اس نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ مزدوری کے ساتھ عمرے کا چانس بھی ملنے پر، سو عمران عاصمہ دو بیٹیوں اور ایک بیٹے کو پیچھے چھوڑ کر انہیں کے مستقبل کی خاطر پیا دیس سدھار گئے۔

عمران نے جا کے تین چار مہینے کے بعد ریال کی منتقلی شروع کی۔ بڑا بیٹا شبیر جس کا داخلہ فرسٹ ایئر میں ہوا تھا اور بڑی بیٹی شہر بانو میٹرک میں تھی۔

عاصمہ کو گھر کا خرچہ الگ بھیجتا اور بچوں کا خرچہ ان کے تایا کو بھیجتا، تا کہ وہ ترتیب سے ان کو چلائے، ان کے تایا بھی بچوں سے بہت پیار کرتے تھے اور وہ خود بھی ایک علم دوست انسان تھے۔ سوا اپنے بچوں کے ساتھ عمران کے بچوں کی تعلیم پر بھی خصوصی نظر رکھتے، پیسے خرچ کے حساب سے دیتا، سال دو سال کے بعد شبیر مزید اعلیٰ تعلیم کے لیے اسلام آباد منتقل ہو گیا۔ یہاں وہ یونیورسٹی پہنچ گیا تھا اب شبیر دوستوں کے ساتھ گھومتے پھرتے، کیفے میں جاتا، اب اس کو محسوس ہونے لگا کہ ابو کا پیسہ ڈائریکٹ اس کے پاس آنا چاہیے اس ان ڈائریکٹ میں وہ خود کو قید محسوس کرنے لگا تھا اس کا اظہار اس نے اپنے ابو سے کیا۔۔۔ میں کہاں پیسے پیسے کے لیے تایا سے مانگتا رہوں؟ ابو آپ پیسے مجھے ہی بھیج دیں۔

عمران نے بھی، سوچا، اچھا ہے اب بیٹا بڑا ہو گیا ہے اور کافی سمجھدار بھی ہے کیوں نہ اسے ڈائریکٹ بھیج دوں، اب عمران نے شبیر سے اکاؤنٹ بنوانے کو کہا اور جیسے ہی اکاؤنٹ میں پیسے آنا شروع ہوئے شبیر نے بھی پر پرزے نکالنا شروع کر دیئے۔۔۔

پہلے دوستوں کے ساتھ جہاں جی چاہتا چلا جاتا کھانا بھی ہوٹلوں میں کھانے لگا۔ پھر موبائل بھی ایک سے ایک بدلنے لگا، عمران پردیس میں خوش کہ میری محنت رنگ لائی، اب میرا بیٹا یونیورسٹی میں پہنچا ہے اور پڑھ رہا ہے ماں اپنی جگہ خوش میں دن رات محنت کر رہی ہوں۔ تو کیا ہوا؟ میرے بچے پڑھ رہے ہیں۔ اچھے سکول اور یونیورسٹی میں ان کو نہیں پتہ تھا۔ ان کا بیٹا ماں باپ کے خواب کے ساتھ محنت کی کمائی کو کسی درخت پر لگے پھل کی طرح کیسے اڑا رہا ہے اور احساس بھی نہیں کہ یہ باپ کی خون پسینے کی کمائی ہے پردیس کاٹ کے لا رہا ہے ماں باپ گھر بچے سب سے دُور اکیلے رہ کے اپنا پیٹ کاٹ کے ان کے مستقبل کو بہتر بنانے کے لیے کیا تگ و دو کر رہا ہے۔ شبیر کو نیا شوق چڑا تھا تو ابا کو کال ملائی۔ ابو مجھے ایک لاکھ بھیج دیں اچھا کیا کرنا ہے؟ بیٹا ابھی ایک مہینہ پہلے تو بھیجے تھے پیسے۔ وہ فیس دے دی تھی۔ پھر کیا کرنا ہے؟

موبائل لینا ہے ابو، وہ تو تمہارے پاس ہے نہ پہلے سے۔ ہاں پر سب دوستوں کے پاس آئی فون ہے، میں نے بھی لینا ہے۔ بیٹا سب کے پاس جو ہے وہ آپ کے پاس ہونا ضروری تو نہیں ہے بیٹا، ہمیں اپنے حساب سے چلنا چاہیے، نہ کہ دوسروں کے نقشے قدم پر، ابو مجھے پسند ہے پہلے آپ پڑھائی مکمل کرو، یہ بھی آجائے گا۔لیکن، مجھے ابھی چاہیے۔ٹھیک ہے لیکن ساتھ پڑھائی بھی اچھی ہونی چاہیے۔ٹھیک ہے ابو شکریہ۔

عمران نے نہ چاہتے ہوئے بھی بیٹے کی خواہش پورا کیا۔ عاصمہ جو خرچہ عمران بھیجتا تھا اس کو بھی کفایت کے ساتھ خرچ کر کے گھر بنا رہی تھی۔ ان سالوں میں اس نے ایک خوبصورت گھر کھڑا کیا تھا۔ بیٹے کو پیسوں نے بگاڑ کے رکھ دیا تھا البتہ بیٹی دل جمعی سے پڑھ رہی تھی۔ یہ بات جب ماں باپ کو پتہ چلی تو دونوں بے حد رنجیدہ ہوئے اور بیٹے کو سمجھایا کچھ اپنے باپ کا احساس ہی کرو، اس کے خون پسینے کی کمائی ہے کوئی چوری کا مال نہیں، جو تم یوں لٹا رہے ہو، ماں نے کال کر کے بہت باتیں سنائی۔لیکن وہ سننے کی حد سے نکل گیا تھا۔ باپ نے بھی سمجھایا تو کہنے لگا ابو میں پڑھائی کر رہا ہوں آپ لوگوں کی باتوں میں مت آنا، لیکن شبیر کی پڑھائی اس کا رزلٹ بتا رہا تھا۔۔۔تیسرا سمسٹر تھا لیکن شبیر نے یونیورسٹی چھوڑ دی تھی۔ ماں باپ کو بہت دکھ ہوا، لیکن کیا کرتا! جوان اولاد تھی، اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔عمران نے بھی واپسی کا ارادہ کیا اور واپس آ گیا۔۔۔ان کچھ سالوں میں ایک خوبصورت سا گھر بن گیا تھا۔ بچوں نے اپنی اپنی خواہشات کو پورا کر لیا تھا اور کر بھی رہے تھے۔ ماں اور بچوں میں محبت کی چاشنی دیکھنے کو ملتی تھی، ان سب پر غور کرنے پر عمران کو ادراک ہوا، اس دوری نے نقصان صرف عمران کا ہوا تھا بچے اور ان کے درمیان فاصلہ آیا تھا۔ بیوی بات بات پہ کہتی، آپ اتنے سالوں بعد آئے ہیں۔ گھر کے معاملات کا آپ کو کچھ نہیں پتہ، آپ چپ رہیں اور بچے صرف پیسے کے لیے باپ کے پاس آتے، عمران نے سوچا میرے حصے میں تنہائی رشتوں سے دوری کے سوا کچھ نہیں آیا۔آہ پردیس آہ زیادہ کمانے کی دھن نے کیا کیا نہیں چھینا مجھ سے۔

❖❖❖❖❖

حاجرہ

کیسی ہو حاجرہ؟ میں ٹھیک ہوں، الحمدللہ۔تم بتاؤ جانو؟ (اصلی نام نور جہان تھی سب پیار سے جانو کہتے تھے) میں بھی ٹھیک ہوں شکر ہے اللہ کا، حاجرہ،تمہاری پڑھائی کیسی جا رہی ہے؟ الحمدللہ ٹھیک ہے۔ ماشاء اللہ! کتنے دن کی چھٹی ہے اور کب تک ادھر ہو تم؟ بس یہی عید کی چھٹیاں اس کے اگلے دن واپس جانا ہے۔اچھا کچھ اور دن رکے گی نہیں؟ نہیں،تم کو تو پتہ ہے میری جنون کا، پڑھ کے مابدولت نے ڈاکٹر بننا ہے اور ملک وقوم کی خدمت بھی کرنا ہے۔تمہیں بھی کتنا سمجھایا، میڈل کے بعد آگے شہر چلو اور داخلہ لے لو، آگے پڑھو،لیکن تم نہیں مانی نہ، ہاں بس۔جی ہاں پر میں بس نہیں کروں، ان شاء اللہ! ڈاکٹر بن کے تمہیں دکھاؤں گی جانو جی اور دیکھنا میں گاؤں میں اپنا ایک ہسپتال بناؤں گی، اس میں غریبوں کا مفت علاج کریں گے۔پھر سارے آس پڑوس والے علاج کے لیے یہاں آیا کریں گے۔ڈلیوری کے لیے عورتوں کو ہسپتال دور ہونے کی وجہ سے جو تکلیفیں اٹھانا پڑتا ہے وہ ختم ہو جائیں گے اور گاڑی نہ ملنے کی جو الگ مصیبتیں ہیں وہ بھی آف جانو کیا بتاؤں،لوگوں کی خدمت کے لیے جو جو خواب اور خواہشیں میں نے پال رکھی ہے۔اللہ کرے وہ سب پورا ہو جائے۔حاجرہ جذب کی عالم میں بولے جا رہی تھی اور جانو طنزیہ انداز میں ٹکٹکی باندھے حاجرہ کو دیکھ رہی تھیں۔ جب حاجرہ خوابوں کی سفر سے نکل کر فخریہ انداز میں جانو کو دیکھنے لگی اور جانو کا طنزیہ انداز دیکھ کر حاجرہ ٹھٹکی کیا ہوا تم ایسے کیوں دیکھ رہی ہے؟ میں نے کچھ غلط کہہ دیا؟ جانو نے ایک آہ بھری اور بولی تمہارے دعوے تمہارے لیے غلط نہیں ہے پر گاؤں اور علاقے کی خدمت کا دعویٰ جھوٹا ہے۔ وہ کیسے؟ اور کیوں جانو؟ یوں میری جذبے کے توہین کر رہی ہیں تم۔میں تمہاری جذبے کی توہین نہیں کر رہی حاجرہ، میں حقیقت بتا رہی ہوں جو تمہاری اور میرے سامنے ہے کتنے لوگوں نے اس بات کا دعویٰ کیا تھا کیا ہے لیکن سب ریت کی دیوار ثابت ہوا ہے۔لیکن میں ایسی نہیں

ہوں، ہاہا تم اور دوسروں میں کیا فرق ہے؟ پتہ ہے ہمارے علاقے کی دوسو سے زیادہ ڈاکٹرز ہیں۔ جب سیٹ پہ جا رہے تھے تو ان سب کا بھی یہی دعویٰ اور جذبہ تھا۔ جب ہمارے علاقے کی فنڈ سے وہ ایک ہنر منداور عزت مند انسان بن گئے تو ان کو اپنا علاقہ بیک ورڈ لگتا ہے۔ ان کی دال یہاں نہیں گلتی، ان کا کاروبار اس چھوٹے علاقے میں نہیں چلتا ہے۔ جانو! جانو! اس مقدس پیشے میں کاروبار کہاں سے آ گیا؟ تم اس پیشے کی توہین مت کرو پلیز، میں کوئی توہین نہیں کر رہی حاجرہ، آج کل ڈاکٹر کے پیشے سے زیادہ منافع بخش کاروبار پاکستان میں نہیں ہے کبھی کلینک میں جا کر دیکھو، اسی لیے تو تمہاری جیسے مخلص لوگ ڈاکٹر بننے کے بعد اپنے گنجان علاقوں میں رہنا پسند نہیں کرتے۔ کیونکہ یہاں کلینک اتنا نہیں چلتا جتنا شہروں میں چلتے ہیں تاکہ مریض بن سکے سٹیٹس بڑھ سکیں۔ تمہیں پتہ ہے olm ہسپتال میں جن کی سیٹ پر کم رکھو تو دوسو سے زاید ڈاکٹر ہے آج غریب عوام کے لیے ایک PHD حاجرہ یہاں بھی میسر نہیں ہے کیوں پتہ ہے یہاں بجلی ہے نیٹ ہے صاف ستھرا ماحول ہے صاف پانی ہے مخلص لوگ ہے بس ایک پرائیویٹ کلینک نہیں چلتا ہے اس وجہ سے کوئی سرجن کوئی ڈاکٹر یہاں آنا اور رہنا پسند نہیں کرتے اس کے لیے پھر عوام پر بوجھ ڈال کے فنڈ سے لاکھوں کاٹ کے ڈاؤن ایریا سے ڈاکٹر خرید کے لانا پڑتا ہے لیکن عوام بے حس ہوتے جا رہے، ہیں نہ احتجاج کرتے ہیں اور نہ آواز اٹھاتے ہیں۔ بس جس راہ پر چلاتے ہیں چپ چاپ چلے چلتے ہیں۔ اف اف جانو جانو تمہیں تو سیاست میں ہونا چاہیے ہے اتنا دردمند دل لے کر تاکہ عوام کا کچھ بلا ہو جائے۔ ڈاکٹروں کے ہی کان کھینچ کر یہاں لا سکے۔ جس دل میں خلوص نہ ہو جتنا کھینچ لیں۔ نہیں رہنے والے اس سے بھی اوپر کا سورس چلا کے واپس بڑے شہر جاتے ہیں۔ اچھا بہت معلومات ہے جانو تمہارے پاس بس تم جیسی مخلوص ڈاکٹروں کی وجہ سے یہ سب، معلومات مل جاتی ہے۔ ڈاکٹر حاجرہ، تمہاری اتنی ساری تقریر سننے کے بعد اب میں ڈاکٹر بننے کی ہمت کھونے لگی ہوں میں اتنے سارے لوگوں کی بددُعا نہیں لے سکتی آج سے توبہ کرتی ہوں، اس سوچ پر بھی، حاجرہ آبدیدہ ہونے لگی، تو جانو نے اٹھ کر حاجرہ کو گلے لگائی، نہیں تم پڑھو گی اور ڈاکٹر بھی بننا بس جن غریب

عوام کی پیسوں سے پڑھو گے ان کا بھی سوچنا، صرف دنیا کی سیٹس آرام کا مت سوچنا، اس مٹی کا بھی سوچنا جس کی وجہ سے تمہاری شناخت بنی ہے دوسروں سے تم منفرد بنا ہے جس کی وجہ سے تمہاری خوبصورت تعمیر ہوئی ہے بس یہ مت بھولنا۔

❖❖❖❖❖

گرمی

آج سورج کا موڈ سخت آف تھا اور وہ اپنے غصے کو نکالنے پر تلا ہوا تھا سورج کی تپش سے لگتا تھا کہ، آج ہر چیز کو پگھلا کر رکھ دے گا۔۔۔ ایسے میں کہیں بھی امن نہیں مل رہا تھا حمیرا اپنے چاروں بچوں کو لے کر ٹین کی چھت کے نیچے بیٹھی کبھی ایک کو تو کبھی دوسرے کو ہاتھ سے پنکھا دینے کی کوشش کر رہی تھی اسی کوشش میں خود بھی پسینے سے شرابور تھی۔۔۔ مگر حمیرا کو اپنی پروا کب تھی بس فکر تھی تو یہ کہ کس طرح اپنے چاروں، لخت جگروں کو اس غضب کی گرمی سے بچائے۔ حمیرا نے کئی بار اپنے شوہر سے کہا، کہ تین تو کمرے ہیں سب میں نہیں تو ایک کمرے میں ہی پنکھا لگوا دیں۔۔۔ تا کہ گرمیوں میں بچوں کو تھوڑا سکون ملے ہم گرمی سہہ لیں گے، لیکن ان معصوم جانوں کو مشکل ہوتی ہے مگر نادر کسی کی سنتا کب تھا الٹا حمیرا کو ہی ڈانٹ ڈپٹ کے چپ کروا دیتا، تم اور تمہارے بچوں کا پیٹ پالوں؟ یا تمہارے یہ جو نچلے پورے کروں؟ جیسے بچے صرف حمیرا کے ہوان کے کچھ نہیں لگتے ایک جان ہے اس کو میں کس کس پر قربان کروں؟ اور بچے ڈر کے امی کو چپ کرواتے چھوڑو امی کوئی بات نہیں ہم صبر کر لیں گے آپ ابا سے مت الجھیں ۔۔۔ دونوں بیٹے کہتے آپ فکر مت کریں امی جب ہم بڑے ہو جائیں گے تو آپ کی یہ خواہش پوری کریں گے اور حمیرا اِن کو دُعائیں دیتی، آنسو پونچھ لیتی، نادر بچوں کو بیوی کی ملکیت سمجھ کر خود بری الذمہ ہونے والے مردوں میں سے تھا۔۔۔ اس لیے جو اپنے جی میں آتا وہی کرتا تھوڑا خرچا پانی کیا لاتا باقی گھر کی ذمہ داریوں اور بچوں کی دیکھ بھال حتیٰ کہ محبت سے بھی بری ذمہ ہو جاتا، آج بھی سورج کی غضب تپش نے اس چھوٹے سے گھرانے کو مشکل میں ڈال رکھا تھا اس کے باوجود پیٹ یہ سب کہاں دیکھتا ہے نہ گرمی نہ سردی، بس وہ وقت پر اپنا ایندھن مانگتا ہے کسی بھی مجبوری سے بے خبر، اگر اسے وقت پر ایندھن نہ ملے تو یہ بھی ناک میں دم کیے رکھتا ہے ایک طرف حمیرا بچوں کو گرمی سے بچانے کے جتن کر رہی تھی تو دوسری طرف بچوں نے

بھوک بھوک کی رٹ لگائی ہوئی تھی۔۔۔بڑے دو تو کچھ سمجھ دار تھے لیکن مزمل اور مانو دونوں ابھی چھوٹے تھے اور ان کی بھوک بھی کچی تھی، حمیرا نے کہا بھی آپ دونوں بس تھوڑا سا صبر کریں ابھی گرمی اتنی زیادہ ہے میں کچن میں نہیں جا سکتی، یہ لو یہ نمکو اور بسکٹ کھا کے گزارا کر لو۔۔۔تب تک سورج کی تپش بھی تھوڑی کم ہو جائے گی تو میں جا کر کچھ پکاتی ہوں۔لیکن بچے کہاں ماننے والے ہوتے ہیں وہ صرف اپنی منوانا جانتے ہیں نہ،نہیں ہم نے ابھی کھانا کھانا ہے آپ ہمیں چاول بنا کیدیں۔۔۔حمیرا ان کی ضد کے آگے ہار کر کچن میں چلی آئی، کچن کیا تھا بس تندور تھا لیکن ماں یہ سب کہاں دیکھتی ہے خود جلنا،خود مٹنا، وہ تو بس بچوں پر مرتے ہیں بچوں کی ہر خواہش پوری کرنے فکر میں رہتی ہے اپنی ہر خواہش پر بچوں کی خواہش کو مقدم رکھتی ہے ان کو چھاؤں دینے کی کوشش میں خود دھوپ میں جلتی ہے بچوں کو چھپر دینے کی چاہت میں خود بارشوں میں بھیگتی ہے۔۔۔حمیرا ابھی اس پگھلا دینے والی گرمی میں بغیر پنکھے کے دوپہر کا کھانا بنا رہی تھی تا کہ بھوک سے بلکتے بچوں کی جان کو امان ملے گرمی سے بچانا اس کی اختیار میں نہیں تھا مگر ان کی بھوک کو مٹانا ضروری تھا تا کہ ماں کی ممتا کو کچھ تو قرار ملے کچھ تو قرار ملے۔۔۔

❖❖❖❖❖

رات بات کرتی ہے

دن بھر کی تھکن کو سمیٹے جب رات کی تاریکی چھا جاتی ہے اور آسمان ستاروں سے بھر جاتے ہیں تو میری آنکھوں میں بھی تارے اتر آتی ہے تیرے یادوں کا تارا اور آہستہ آہستہ دن بھر کی تھکن اترنے لگتی ہے اور میں ان تاروں میں وہ روشن تارہ ڈھونڈنے لگتی ہوں۔۔۔ کیونکہ تم مجھے آسمان کا سب سے روشن ستارے کی مانند لگتی ہے جب وہ تارہ نظر آتی ہے تو دل کی زمین پر خوشیاں رقص کرتی ہے ساتھ ساتھ تم سے دوری کا احساس آنکھوں کو نم کرتی ہے۔ آنسو اور روشن تاروں کی ملاپ سے عجیب تال میل پیدا ہوتی ہے اس کو لفظوں میں بیان نہیں کر سکتی، بس محسوس کیا جاتا ہے۔ ہے نہ؟ عجب بات انسان جو باتیں کسی کو بتا نہیں سکتی جو دن بھر اپنی کیفیت چھپانے میں گزرتی ہے مگر رات ہوتے ہی سارا دکھ ساری درد تاروں کے ساتھ بانٹ لیتی ہے رات بھی اللہ کی طرف سے کتنی بڑی نعمت ہے انسان کی دکھ درد کو راز داری سے اپنے اندر چھپا لیتا ہے اور کسی کو بتاتا بھی نہیں ہے۔ نہ طعنہ دیتا ہے بس ماں کی طرح انسان اور انسان کے دکھ کو بھی اپنے آغوش میں چھپا لیتی ہے اور کبھی احسان بھی نہیں جتاتا کتنی مہربان ہے نہ؟ لوگ رات کو سیاہ، نا جانے کیا کیا کہتے ہیں لیکن میں نے رات کو ہمیشہ مہربان پایا ہے ماں کی طرح نرم باپ کی طرح شفیق،، جو ہمارے بکھرے وجود کو سمیٹتا ہے دکھ، درد اور آنسو کو بھی، کسی کو خبر بھی نہیں ہونے دیتا کہ، کون کب کس طرح اس کی آغوش میں بکھرا تھا کس کی رکی ہوئی فریاد نے ان کے آگے بند توڑا تھا۔

چھت کی خاموشی میں تاروں کا ساتھ ہو اور ان کی یاد ہو، تو لگتی ہے رات بات کرتی ہے کبھی آپ نے محسوس کیا؟ رات کا بات کرنا رات بات کرتی ہے اور ہماری باتیں سنتی ہے رات تو وہ عشق ہے جو اپنے محبوب سے بے وفائی نہیں کرتا۔ بلکہ ہر کیسی کی اچھائی، برائی، سمت خود میں پناہ دیتی ہے۔ رات آہستہ آہستہ بیت رہی ہے تاروں کی روشنی مدہم پڑ رہی ہے اور مجھے پتہ بھی

نہیں چلی کہ تاروں کے ساتھ تیرے یادوں کی حسین نگری میں گھومتے رات ڈھل گئی ہے۔ تیراا حساس مجھے یوں مدہوش کرتا ہے اگر تیرا ساتھ مل جائے تو کیا ہوگی؟ رات ہواور تاروں بھرا آسمان ایسے میں تجھے سوچنا بہت خوش کن احساس سے دوچار کر دیتی ہےاور بے اختیار دل سے دُعا نکلتی ہے اس بولتی کسی رات میں تم میرے ساتھ ہو، تیرے ہاتھ میں میری ہاتھ ہواور جو باتیں میں نے تاروں کے پاس امانت رکھی تھی وہ ساری، امانتیں تمہیں سونپ دوں، تیرے آنکھوں کی روشنی سے اپنی رات روشن کروں، تجھے سے دل کی ساری بات کروں سمٹ کر غموں کو خوشی کی شروعات کروں، میں انتظار کروں گی اس دن کا، ان لمحوں کا، کسی دن یہ سب حقیقت کا روپ دھار کر میری سامنے آئے میری سامنے آئے۔۔۔

❖❖❖❖❖

دل کے پھپھولے

سارا ڈیوٹی پر پہنچی تو کافی مریض آئے ہوئے تھے۔سارا نے اپنی آیا سے کہا مریضوں کو ایک ایک کر کے اندر بھیجو مریض آ جا رہی تھی۔آخر میں جو مریض آئی تھی وہ عمر میں چھوٹی لگ رہی تھی لیکن اس نے گود میں بچی بٹھائی ہوئی تھی۔سارا نے اس کو بٹھائی اور پوچھا جی بتائے؟ کیا مسئلہ ہے؟ اور یہ بچی کس کی ہے؟ کیونکہ دیکھنے میں میں وہ خود بچی لگ رہی تھی اپنا نام بتانا یہ پوچھنا تھا۔ وہ لڑکی شروع ہوگئی، جی میرا نام حنا ہے۔۔۔ یہ میری بچی ہے میرا دو سال پہلے شادی ہوئی ہے اور ابھی بچی ایک سال کی ہے اچھا، اتنی جلدی تم نے شادی کیوں کی ہے؟ کیا تم پڑھتی نہیں ہے؟ باجی میں کیا بتاؤں مجھے تو پڑھنے کا بہت شوق تھا۔لیکن میری ماں باپ کو میری شادی کی جلدی تھی اس لیے میری شادی کر دیا ہے۔اب میں ایک عذاب سے گزر رہی ہوں باجی جو بات میں آپ کو بتاؤں گی آپ کے پاس امانت ہے۔۔۔آج تک میں نے اپنی دکھ کسی کو نہیں بتایا ہے آج آپ کو دیکھ کر پتہ نہیں کیوں دل چاہتا ہے۔اپنے دکھ میں آپ کو شامل کروں اور اپنی دل کا بوجھ ہلکا کروں، آپ سے مل کر اپنائیت سی محسوس ہو رہی ہے۔۔۔ ہاں! ہاں! کیوں نہیں، جو بھی ہے بتاؤ، میں کسی کو نہیں بتاؤں گی، تم اطمینان رکھو اور اپنی دل کا بوجھ ہلکا کرو، میں سن رہی ہوں یہ بھی تو ہمارے پیشے میں شامل ہے نا دکھ درد کو سنا سارا نے کہا تو حنا کو اطمینان ہوا ایک لمبی سانس بھر کر بولنا شروع کیا۔۔۔

باجی میں پڑھنا چاہتی تھی بہت سارا نہیں تو کم از کم میٹرک کرنا چاہتی تھی۔ پڑھنا میرا شوق تھا۔لیکن ابھی میں آٹھویں کلاس میں تھی میرا رشتہ انے لگا، میں نے اپنی امی ابو سے کہا ابھی میں پڑھنا چاہتی ہوں میں شادی نہیں کرنا چاہتی، پر امی ابو نہیں مانا اور کہنے لگا جتنی جلدی ہو، لڑکیوں کی شادی کرنا چاہیے ہے۔۔۔اس پر میں رونے لگی اور ان کی منتیں کرنے لگی، آپ لوگ مجھے صرف میٹرک پاس کرنے دیں اس کے بعد جو آپ لوگ کہے میں تیار ہوں تو انہوں

نیکہا ٹھیک ہے۔شادی نہیں کرتی صرف نکاح کر کے رکھتی ہے شادی تمہاری میٹرک پاس ہونے پر کریں گے۔۔۔اس طرح میرا اور احسان کا نکاح ہو گیا۔نکاح کے بعد ایک سال ہی سکون سے پڑھ سکی۔۔۔لیکن نائن میں پہنچ کر احسان کے گھر والوں نے شادی کے لیے کہا اور احسان بھی کہنے لگے۔میں نے کہا میں ابھی شادی نہیں کروں گی،اپ لوگ نے دو سال کا وعدہ کیا ہے۔دو سال پورا ہونے سے پہلے میں قطعی شادی نہیں کروں گی،اس پر احسان ناراض ہونے لگے اور مجھے سیکہا تم مجھے پسند نہیں کرتی ہے نہ؟ یا تم کسی اور کو پسند کرنے لگی ہو؟ اس بات پر مجھے غصہ آ گئی اور کہا آپ کیسی بات کر رہا ہے؟ میں آپ کی نکاح میں ہوں کسی اور کو کیوں پسند کرنے لگی؟ میرا مقصد صرف اور صرف اپنی پڑھائی کا شوق پورا کرنا ہے اور کچھ نہیں ہے کیونکہ مجھے پڑھنے کا بہت شوق ہے اچھا، سچ میں ایسا ہے نا؟ ہاں سچ میں یہی بات ہے۔۔۔یہ کہ کر وہ چلا گیا۔اور میں دکھ سے رونے لگ گئی ایک تو مجھے پڑھائی کرنے نہیں دے رہا،اوپر سے مجھے پر شک بھی کرتا ہے یہ سوچ مجھے روز رولاتی، کچھ دن گزرے تو احسان نے ایک موبائل لا کر دیا اور کہا کہ میں اس سے بات کروں، میں نے انکار کیا کہ میں میٹرک ہونے تک ایسا کچھ نہیں کروں گی میں کہیں بھاگی نہیں جا رہی ہے۔آپ کی نکاح میں ہوں اور یہاں پر ہی ہوں، پر اس نے نہیں مانا اور میرے ماں باپ کو یہ ڈر لاحق ہو گیا کہیں یہ بات طلاق تک نہ پہنچے،اس لیے انہوں نے میری شادی کا فیصلہ کیا۔یوں میں میٹرک پاس کرنے کی حسرت لیے پیا دیس سدھار گئیں۔اولین دنوں کی خوبصورتی ختم ہوتے ہوتے میں بھی ختم ہونے لگی،احسان کوئی کام نہیں کرتا تھا۔نہ کوئی جاب تھی نہ محنت مزدوری کرتا دن بھر آوارگردی کرتا اور شام کو گھر اکر مجھے پر شک کرتا تم کسی کو پسند کرتی تھی نہ؟ اس لیے شادی سے انکار کرتی رہی،تمہیں میں پسند نہیں تھا نہ؟ اور میں قسمیں کھا کھا کر اس کو یقین دلاتی ہوں لیکن ان کا شک دور ہی نہیں ہوتا اوپر سے معمولی معمولی باتوں پر اتنا غصہ آتا ہے میں ڈر کے چپ ہو جاتی ہوں اور ابا یک سال ہوا ہے۔بیٹی ہو کے میرا خرچہ تو پورا نہیں کرتا تھا اب بیٹی کے لیے مجھے اپنی ماں بھائی کے اگے ہاتھ پھیلانا پڑتی ہے۔ابا تو میری شادی کے بعد اللہ کو پیارا ہو گیا تھا۔اب ماں اور بھائی چپ چاپ

میری اور بیٹی کا خرچا دیتی ہے۔ کیونکہ انہوں نے ہی مجھے زبردستی اس جہنم میں بھیجا تھا اس وجہ سے کچھ نہیں کہتا اور میں روز مرتی ہوں روز جیتی ہوں حنا مسلسل بولتی جا رہی تھی اور سارا کو بولنے کا موقع بھی نہیں دے رہی تھی اب ادھا گھنٹہ ہو گیا تھا۔ سارا کو اس کی دکھ سنتے ہوئے سارا اس کو چپ کرا بھی نہیں سکی کیونکہ سارا کو پتہ تھی اگر دکھ انسان کے اندر رہ جائے تو یہ ناسور بن جاتی ہے۔ یہ لفظوں کے ذریعے باہر نکل جائے تو بھی کچھ سکون ملتی ہے اور دل سے بوجھ بھی ہٹ جاتا ہے۔ انسانیت کی خدمت اور سارا کی پیشے کا تقاضا بھی یہی تھا کہ اس کے پاس انے والی مریضوں کو صرف دوا نہیں ان کو غور سے دل سے سنا بھی چاہے ہے۔ سو سارا نے حنا کو پوری صبر و تحمل سے سن کر تسلی دے کر مطمئن کر کے بھیج دیا حنا اپنی دل کے پھپھولے پھوٹ کر جا چکی تھی اور سارا اس راستے کو دیکھتی سوچ رہی تھی جہاں سے ابھی ابھی حنا گئی تھی آہ لڑکیاں شادی سال ہونے کے بعد عمر 20 سال کی ہو یا 18 کی دکھ درد اس کو ایک مکمل عورت بنا دیتی ہے اور عورت دکھ درد کا جواں مردی سے برداشت کرنا سیکھ جاتی ہے صبر کرنا اور اس پر قائم رہنا بھی سیکھ جاتی ہے ماں باپ کی خاطر اولاد کی خاطر خود کو قربان کر کے اپنی ہستی کو مٹی کرنے کی صلاحیت سے بھی مالا مال ہوتی ہے آہ عورت عمر کی تقصص نہیں ہوتی عورت تو وہ مٹی ہے۔ جسے کسی بھی روپ میں ڈھالے ڈھل جاتی ہے ڈھل جاتی ہے۔۔۔

❖❖❖❖❖

جنت کا راستہ

کنیز فاطمہ کی آنکھیں نم ہوگئی تھیں۔اتنی بڑی خوشی سنبھالی نہیں جا رہی تھی۔ وہ کئی بار سجدۂ شکر ادا کر چکی تھیں۔ کنیز فاطمہ کی ہمیشہ سے یہ خواہش تھی کہ کوئی ایسا راستہ ملے جو جنت کی طرف جاتا ہو اور وہ کوئی ایسا نیک عمل کرنا چاہتی تھیں جس پر چلتے ہوئے ہر کوئی اس راستے پر ان کا ہم سفر بنے۔ جب سوچ خالص ہو اور نیت صاف ہو اور خواہش بھی وہ ہو جس پر چل کر جنت میں داخلہ نصیب ہو، تو اللہ تعالیٰ خود ہی راستے ہموار کر دیتے ہیں۔

کنیز فاطمہ کے ذہن میں ایک خیال آیا، کیوں نہ ایک واٹس ایپ گروپ بنایا جائے؟ دنیا داری کے لیے تو ویسے بھی گروپس بنائے جاتے ہیں، آج کیوں نہ جنت کے لیے بھی ایک گروپ بنایا جائے؟ سوچ کے ساتھ ہی کنیز فاطمہ نے فوراً عمل شروع کر دیا۔سب سے پہلے انہوں نے اپنی بہنوں کو گروپ میں شامل کیا، پھر رشتہ داروں کو بھی شامل کیا۔

گروپ بنانے کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں میں درود پاک پڑھنے کی عادت ڈالی جائے۔ کنیز فاطمہ نے سب کو بتایا کہ روزانہ کی بنیاد پر درود شریف گن کر پڑھا جائے اور جتنا ممکن ہو، گروپ میں شیئر کیا جائے۔ اس طرح یہ عمل آہستہ آہستہ عادت بن جائے گا اور اس سے روزانہ سرورِ کائنات (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کے دربار میں حاضری بھی یقینی ہوگی۔

خواتین بڑھ چڑھ کر گروپ میں شامل ہونے لگیں اور دربارِ رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) میں درود پاک کا نذرانہ پیش کرنے میں حصہ لینے لگیں۔ جیسے جیسے گروپ بڑا ہوتا گیا، کنیز فاطمہ نے زیادہ فعال اراکین کو ایڈمن بنا کر ان کا الگ گروپ تشکیل دینا شروع کر دیا اور پھر وہ ایڈمن خود اپنے گروپ میں مزید ممبرز شامل کرتیں۔ یوں ایک زنجیر بنتی چلی گئی۔

کنیز فاطمہ نے ایک ایڈمن گروپ بھی بنایا تاکہ تمام گروپس کی پڑھی گئی درود شریف کی تعداد وہاں جمع کر لی جائے اور پھر خواتین کو مجموعی تعداد بتائی جائے، جس سے ان کے شوق میں

مزید اضافہ ہو۔ الحمدللہ، اس کام میں کنیز فاطمہ بہت کامیاب رہیں۔ یہ دیکھ کر ان کی آنکھیں بار بار نم ہو جاتیں اور وہ سجدہ شکر ادا کرتیں، لیکن انہیں لگتا کہ وہ اللہ کی اس کرم نوازی کا شکر صحیح طرح ادا نہیں کر پا رہیں۔

آج کنیز فاطمہ کے گروپس کی تعداد 50 سے تجاوز کر چکی تھی اور روزانہ لاکھوں کی تعداد میں درود پاک پڑھا جا رہا تھا۔ جو راستہ انہوں نے تنہا شروع کیا تھا، اس پر آج بے شمار لوگ ان کے ہم سفر بن چکے تھے اور یہ سلسلہ زنجیر کی طرح بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس زنجیر کو تا قیامت ٹوٹنے نہ دے۔ آمین

❖❖❖❖❖

چائے

مہرو کے گھر میں چائے صرف ایک مشروب نہیں بلکہ زندگی کا حصہ تھی۔ صبح ساڑھے سات بجے ناشتے سے فارغ ہوکر مہرو نے برتن دھوئے اور بڑے سلیقے سے شیلف پر ترتیب سے سجا دیے۔ وہ ابھی مطمئن بھی نہ ہوئی تھی کہ دروازے پر آواز آئی، السلام علیکم! مڑ کر دیکھا تو خالہ اماں تھیں۔ امی نے مہرو کو آواز دی، مہرو، خالہ کو چائے دینا۔

مہرو نے فوراً ٹرے میں کپ رکھے، چائے پیش کی اور پھر واپس صفائی کے لیے لوٹ گئی۔ ابھی جھاڑو اٹھائی ہی تھی کہ ایک اور سلام کی آواز نے کام روک دیا۔ امی نے کہا، مہرو! ماموں کریم کو چائے دے دو۔ مہرو نے دل میں سوچا، امی بیٹھنے تو دو، پھر دے دوں گی۔

مہرو گاؤں میں رہتی تھی جہاں ہر کوئی کسی نہ کسی کام سے یا رشتے داری میں ایک دوسرے کے ہاں جانا ہوتا تھا۔ گاؤں والے سب اپس میں کسی کو ماموں کہا جاتا، کسی کو خالہ اور کسی کو باجی۔ مہرو کے گھر صبح سے شام تک مہمانوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔

چائے بنا کر تھرموس میں رکھا تھا ساتھ میں مہرو نے چولہے پر پانی بھی چڑھا رکھا تھا تاکہ چائے کی قلت نہ ہو۔ ابھی وہ چولہے کو پھونک مار رہی تھی کہ ابو چھ سات مہمانوں کے ساتھ دروازے پر نمودار ہوئے۔ ابو نے کہا، ”مہرو، چائے ہے؟“

مہرو نے جواب دیا۔ ”جی ابو، ابھی لاتی ہوں۔“

اس بار دس کپ ٹرے میں رکھے گئے۔ چائے ختم ہو چکی تھی، اس لیے مہرو نے جلدی سے نئی چائے بنائی۔ ابو مہمانوں کو بغیر چائے پلائے روانہ کرنے کے سخت خلاف تھے، خاص طور پر نمکین چائے کے بغیر۔

چائے کے مراحل ختم ہونے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ جیسے ہی ابو کے مہمان رخصت ہوئے، بھائی اپنے دوستوں کے ساتھ آ گئے۔ ”مہرو، چائے ہے؟ جلدی پلاؤ، ہمیں جانا ہے۔“

مہرو نے تھکن سے کہا، ''جی بھائی، ابھی دیتی ہوں۔''

پانچ اور کپ بھرے گئے، لیکن اب مہرو کی کمر درد سے ٹوٹ رہی تھی۔ صبح سے ایک لمحے کی بھی فرصت نہیں ملی تھی۔ صفائی کا کام ابھی باقی تھا، اور بھابھی نے بھی آ کر یہی کہنا تھا، ''مہرو، تم اب تک گھر کی صفائی نہیں کر سکیں؟'' حالانکہ انہیں معلوم تھا کہ مہرو کا دن چائے کے کپ دھونے میں گزر جاتا ہے۔

مہرو نے دل میں پکا ارادہ کیا کہ آج گھر ضرور چمکا کر دم لے گی۔ لیکن جیسے ہی اس نے جھاڑو پکڑی، پھر ایک اور مہمان آ گئے۔ امی نے کہا، ''مہرو، چائے دینا۔''

یہ سن کر مہرو کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ ''امی، یہ گھر ہے یا سرائے، صبح سے چالیس کپ والے تھرموس دو بار بھر چکی ہوں۔ ابھی دن کے صرف گیارہ بجے ہیں، شام تک نہ جانے کتنی بار بنانی پڑے گی۔''

امی مسکرا کر بولیں، ''مہمان اللہ کی رحمت ہوتے ہیں، شکر ادا کرو کہ کوئی چائے پینے والا ہے۔''

مہرو جل کر بولی، ''امی، چائے نے میری کمر توڑ دی ہے۔ اگر کھانے کے مہمان آتے تو شاید سانس لینے کی بھی مہلت نہ ملتی۔''

دن کے اختتام پر مہرو تھکن سے چور ہو چکی تھی۔ چائے، مہمان اور برتنوں کے درمیان پھنسے اس دن نے اسے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ یہ گھر ہے یا واقعی سرائے؟''

❖ ❖ ❖ ❖ ❖

اداس آنکھوں کی کہانی

قندیل کی آنکھوں میں ایک عجیب سا سکوت تھا، جیسے وہ کسی گہرے راز کو چھپائے بیٹھی ہو۔ میں اکثر اسے دیکھ کر کہتی، ''تمہاری آنکھوں کی اداسی کبھی کم نہیں ہوتی۔''

وہ اپنی گہری، خوابوں سے لبریز آنکھوں کو مسکانے کے ساتھ مجھ پر جماتے ہوئے جواب دیتی۔

''نور، بس! یہ شاعری بند کرو اور اپنے کام پر دھیان دو۔''اس کی باتوں میں مزاح ہوتا، مگر ان آنکھوں میں ایک ایسا دکھ تھا جسے وہ چھپانے کی ہر ممکن کوشش کرتی رہتی۔

قندیل بہت زندہ دل تھی، ہر کسی سے جلد گھل مل جاتی، دوسروں کی مدد کے لیے ہمیشہ تیار رہتی۔ اس کی گفتگو میں ایک جادو تھا، لیکن میں جانتی تھی کہ اس کے اندر کچھ ٹوٹا ہوا ہے۔ مجھے اس سے انسیت ہو گئی تھی اور شاید محبت بھی۔ مگر اس کی آنکھوں کی اداسی ایک معمہ بنی رہی۔ ایک دن آخر کار میں نے پوچھ ہی لیا۔

تمہاری آنکھوں کی اداسی کا راز کیا ہے؟ یہ تمہاری خوبصورتی کو بڑھا تو دیتی ہے، مگر مجھے بے چین بھی کرتی ہے۔ وہ تھوڑا ہچکچائی، پھر گویا ہوئی۔

نور، میرے خواب ایک ایک کر کے ٹوٹے ہیں۔ پہلا خواب یہ تھا کہ میں خوب پڑھوں، ایم۔اے اردو ادب کروں اور ایک بڑا انسان بنوں۔ لوگوں کی خدمت کروں مگر حالات ہمیشہ میرے راستے کی دیوار بنے رہے۔ میٹرک کے بعد مجھے ایڈمیشن نہیں ملا اور میں پرائیویٹ امتحانات دینے لگی۔ بیماری نے میرا ساتھ نہ چھوڑا اور چار سال میں بمشکل ایف اے کر سکی۔

میں نے حیرت سے پوچھا۔

''اتنی مشکلات کے باوجود، تم نے کبھی محبت کا سہارا کیوں نہ لیا؟''

وہ ہنس پڑی۔

''محبت؟ نور! محبت زندگی کا ایک حسین حصہ ضرور ہے، مگر میرے خواب ہمیشہ اس سے بڑے تھے۔ کتابیں پڑھنا شاعری کرنا، کہانیاں لکھنا، یہ سب میرے خواب تھے۔ لیکن ان خوابوں کو حقیقت بنانے کے لیے کوئی رہنمائی نہ ملی۔ میری دنیا میں محبت اور شادی کے لیے جگہ ہی نہیں تھی۔''

''اس کی باتوں نے مجھے سوچ میں ڈال دیا۔'' میں نے آہستہ سے پوچھا

''تو پھر، کوئی خواب پورا نہیں ہوا؟''

وہ مسکرائی، مگر آنکھوں میں وہی اداسی تھی۔

ایک خواب پورا ہوا، نورا اور وہ تھا کربلا اور شام جانا۔ زیارت کے لیے جانے کا خواب میری سب خوابوں پر بھاری تھا۔ میری پیاس میں شام کی خاک شامل تھی۔ پھر ایک دن اللہ نے میری دل کی فریاد سن لی اور میرے خواب کو سرخرو کیا۔ لیکن اس کے بعد بیماری نے مجھے دوبارہ گھیرا اور میں ڈھ گئی۔ میرے خواب ٹوٹتے رہے، لیکن میں نے ہار نہیں مانی۔ میں آج بھی جی رہی ہوں، سانس لے رہی ہوں اور سب سے بڑھ کر، ان ٹوٹے خوابوں کے ساتھ جینے کی کوشش کر رہی ہوں۔ جو میرے رب کو منظور ہے، مجھے وہی قبول ہے۔

قندیل کی باتوں نے میرے دل کو جھنجھوڑ دیا۔ اس کی آنکھوں کی اداسی کے پیچھے چھپی کہانی نہ صرف اس کی شخصیت کو نکھارتی تھی، بلکہ مجھے زندگی کو ایک نئی نظر سے دیکھنا سکھاتی تھی۔ وہ اپنے ٹوٹے خوابوں کے ساتھ بھی زندہ دل تھی اور شاید یہی بات اسے سب سے خاص بناتی تھی۔

❖❖❖❖❖

لاتقنطومن رحمۃ اللہ

صفیہ نے جائے نماز تہہ کر کے شیلف پر رکھ دی، ایک نظر بچوں پر ڈالی، پھر چولہے کے پاس آ بیٹھی۔ مدہم پڑتی آگ کو پھونک مار کر دوبارہ جلایا، جیسے اپنی دم توڑتی امید کو اللہ کے ذکر سے جِلا بخش رہی ہو۔ کچھ دیر سوچتے ہوئے آٹا گوندھنے لگی۔ شام ہو چکی تھی، مگر احمد ابھی تک کام سے نہیں لوٹا تھا۔ آٹا گوندھ کر اس نے چولہے پر رکھی سبزی کو چمچ سے ہلایا، جو تقریباً پک چکی تھی۔ بچے جلدی سونے کے عادی تھے، اس لیے صفیہ رات کا کھانا سرِ شام ہی تیار کر لیتی تھی، تاکہ وہ بھوکے نہ سوئیں۔ کھانا تیار ہونے تک احمد بھی گھر آ پہنچا۔ صفیہ نے خفگی سے اس کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''اتنی دیر کہاں لگا دی؟ ذرا جلدی آیا کریں، مجھ سے سب سنبھالا نہیں جاتا۔''

ہاں، آتے ہوئے اذان ہو رہی تھی، تو مسجد میں نماز پڑھنے رک گیا تھا۔ احمد نے جواب دیا۔ ''اچھا، اچھا۔'' صفیہ نے مختصر جواب دیا۔ احمد نے بیٹی کو گود میں اٹھا لیا۔ وہ دونوں آنکھوں سے نابینا تھی۔ ان کے دو بچے نابینا تھے اور دو تازہ، مگر اکثر بیمار رہتے۔ ماں باپ علاج معالجے کے ساتھ ساتھ روزی روٹی کے لیے بھی جدوجہد میں لگے رہتے۔ کچھ دن خیریت سے گزر گئے، مگر پھر عبداللہ کے گھٹنے میں شدید درد شروع ہو گیا اور اسحاق بھی سست سا لگنے لگا۔ احمد اور صفیہ انہیں قریبی اسپتال لے گئے۔ ڈاکٹر نے معائنہ کر کے بتایا۔ ''چھوٹے کو یرقان ہے اور بڑے بیٹے کو فوراً بڑے اسپتال لے جانا ہوگا۔ دیر مت کریں۔''

یہ سنتے ہی دونوں میاں بیوی پریشان ہو گئے۔ گھر لوٹ کر احمد سر پکڑ کر بیٹھ گیا، جبکہ صفیہ بے بسی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ گھر میں ایک روپیہ بھی نہیں تھا۔ احمد کی مزدوری روز کے کھانے پر خرچ ہو جاتی اور ویسے بھی کوئی بچت نہ تھی۔ اوپر سے ہر چند دن میں کوئی نہ کوئی بیمار پڑ جاتا۔

صفیہ بے اختیار بولی۔ ''اب ہم کیا کریں گے، احمد؟ ہمارے پاس تو کرائے کے پیسے بھی نہیں ہیں، علاج کہاں سے کروائیں گے؟'' احمد نے گہری سانس لی اور کہا۔ ''کسی دوست یا رشتہ دار سے قرض مانگ لیتے ہیں۔''

''کس سے؟ کون دے گا؟ امی سے مانگنے کی بھی ہمت نہیں ہو رہی۔'' صفیہ نے روتے ہوئے کہا۔

احمد نے نرمی سے کہا، ''صفیہ، تم ہی کہتی ہو کہ اللہ اپنے پسندیدہ بندوں کو آزماتا ہے۔ جب کبھی میں مایوس ہوتا ہوں، تو تم مجھے یہ آیت سناتی ہو: لاتقنطو من رحمۃ اللہ۔ اب تم خود اس پر عمل کیوں نہیں کر رہی؟ مایوس کیوں ہو رہی ہو؟ اللہ ضرور کوئی سبیل نکالے گا۔'' یہ کہہ کر احمد باہر چلا گیا اور صفیہ آنسو پونچھ کر بچوں کو دیکھنے لگی۔

کچھ دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ صفیہ نے دروازہ کھولا، تو دیکھا کہ ہمسائے کی خالہ سکینہ کھڑی تھیں۔ سلام دُعا کے بعد وہ اندر آئیں اور نرمی سے بولیں، ''بیٹی، سنا ہے عبداللہ بیمار ہے اور ڈاکٹر نے شہر لے جانے کو کہا ہے۔ سوچا، احمد کو مزدوری بھی نہیں ملی ہوگی اور تمہارے پاس شاید کچھ بچت بھی نہ ہو۔ یہ کچھ پیسے رکھے تھے، وہی تمہیں دینے آئی ہوں۔'' صفیہ چپ چاپ انہیں دیکھتی رہی۔ دل بار بار کہہ رہا تھا: لاتقنطو من رحمۃ اللہ۔ آنسو بھری آنکھوں سے ہاتھ بڑھا کر پیسے لے لیے، تو خالہ سکینہ نے آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا اور دلاسہ دینے لگیں، ''مت رو میری بچی، ان شاء اللہ دونوں بچے صحت یاب ہو جائیں گے۔'' اور صفیہ وہ اللہ کی رحمت پر، صحرا میں کھلنے والے پھول پر، بے اختیار رو رہی تھی۔

❖❖❖❖❖

خواب کا سفر

دور تک پھیلا ہوا ایک وسیع ریگستان تھا، جہاں کہیں کہیں کھجور کے درخت نظر آ رہے تھے۔ ان ریتیلے راستوں پر قافلے چل رہے تھے۔ کچھ لوگ اونٹوں پر سامان لادے جا رہے تھے، تو کچھ آ رہے تھے۔ مرد، عورتیں، بچے، بوڑھے سبھی اس سفر میں شریک تھے۔ عورتوں کا لباس مکمل تھا، ان کے سر پر دوپٹے تھے اور وہ باوقار انداز میں چل رہی تھیں۔

منتہیٰ مہناز ایک نکڑ پر کھڑی حیرت سے یہ سب دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ جہاں وہ رہتی ہے، وہاں نہ ریگستان ہے، نہ اونٹ اور نہ ہی خواتین ایسا لباس پہنتی ہیں۔ وہاں تو کسی کے پاس دوپٹہ نہیں تو کسی کے پاس گلے نہیں، کسی کے پاس آستین نہیں تو کسی کے پاس پائنچے نہیں ہے مگر یہاں جو خواتین نظر آ رہی تھیں، وہ مکمل لباس میں بھی نہایت خوبصورت اور باوقار دکھائی دے رہی تھیں۔ اس کی نظر دور تک بکھرے ان راستوں پر گئی اور دل میں ایک خیال بجلی کی طرح کوندا۔ کہیں وہ زمانہ اللہ پیغمبر میں تو نہیں آ گئی؟ یہ ریگستان، یہ اونٹ، یہ راستے اور یہ باپردہ عورتیں سنا تھا کہ یہ سب عرب میں ہوا کرتا ہے وہی عرب جہاں سے اسلام کی روشنی پھیلی تھی اور جوامتِ محمدیہ کا اثاثہ تھا۔ یہ سوچ آتے ہی اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں اور وہ خوشی، حیرانی اور بے یقینی کی ملی جلی کیفیت میں ادھر اُدھر کچھ تلاش کرنے لگی، شاید کہیں کعبہ یا مدینہ نظر آ جائے۔ یہ تو اس کا خواب تھا کہ وہ ایک بار ان مقدس جگہوں پر جائے، ان ریگستانوں میں جہاں اس کے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے قدم پڑے، اس خاک کو آنکھوں سے چومے اور ان فضاؤں میں سانس لے۔

اسی جذبے میں وہ ایک قافلے کے قریب جا پہنچی اور پوچھا، یہ کون سی جگہ ہے؟ اور آپ لوگ کہاں جا رہے ہیں؟ ایک شخص نے شفقت سے جواب دیا، بیٹی، ہم مدینے جا رہے ہیں، میں تاجر ہوں اور تجارت کے لیے جا رہا ہوں۔ اچھا، یہ مدینے کا راستہ ہے؟ منتہیٰ نے بے

اختیار پوچھا۔جی بیٹی، مدینہ اب زیادہ دُور نہیں ہے میں بھی جانا چاہتی ہوں، مجھے وہاں جانے کا بہت شوق ہے، بلکہ پورے عرب کی زیارت کا جہاں جہاں ہمارے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے قدم پڑے تھے۔اس شخص نے مسکراتے ہوئے کہا ''تو چلیں ہم بھی وہاں جارہے ہیں۔''

''جی چلیں۔''منتہیٰ نے کہا اور اسی لمحے اس کی آنکھ کھل گئی۔وہ حیران ہو کر اندھیرے میں ادھر اُدھر دیکھنے لگی تب سمجھ ائی وہ سب تو ایک حسین خواب تھا حقیقت میں وہ اپنے بستر پر سو رہی تھی۔خواب تھی پر خوبصورت تھی ایک طمانیت بھری سانس لے کر اس خوبصورت خواب میں پھر کھو گئی۔

❖❖❖❖❖

پرواز کی خواہش

اسما ہمیشہ آسمان کی بلندیوں کو چھونے کا خواب دیکھا کرتی تھی۔ وہ ہر گزرتے ہوئے جہاز کو دیکھ کر دل ہی دل میں خود کو اس کے کاک پٹ میں محسوس کرتی۔ لیکن تعلیم میں اس کی کارکردگی کچھ خاص نہیں تھی۔ وہ محنت تو کرتی، لیکن جب گریجویشن کے امتحان میں سپلی آئی، تو اس کا دل بجھ سا گیا۔ اسے لگا شاید اس کا خواب ہمیشہ کے لیے ٹوٹ جائے گا۔

اس کے والدین نے اس کی پریشانی کو محسوس کیا۔ وہ جانتے تھے کہ اسما کے دل میں جہاز اڑانے کا جنون ہے۔ اس کے والد نے اس سے کہا۔

''تعلیم کا مقصد صرف ڈگری لینا نہیں، بلکہ اپنے خواب کو حقیقت بنانا ہے۔ اگر تم واقعی پائلٹ بننا چاہتی ہو، تو ہم تمہیں اس راستے پر چلنے دیں گے۔''

یہ الفاظ اسما کے لیے نئی امید بن گئے۔ اس کے والدین نے اسے پائلٹ کا کورس کرنے کے لیے بھیج دیا۔ وہاں اسما نے اپنی ناکامیوں کو پیچھے چھوڑ کر اپنے خوابوں کی دنیا میں قدم رکھا۔ کورس مشکل ضرور تھا، لیکن اسما نے اپنی محنت اور جنون سے سب رکاوٹوں کو عبور کیا۔

جب وہ کورس مکمل کر کے ایک کامیاب پائلٹ بن کر گھر لوٹی، تو اس کی آنکھوں میں فخر اور خوشی تھی۔ لیکن اسی بشام، جب وہ اپنی ماں کے ساتھ بیٹھی اپنی کامیابی کے بارے میں بات کر رہی تھی، اس کی ماں نے کہا۔

''بیٹا، تم نے جو کچھ حاصل کیا ہے، وہ تمہاری محنت کا نتیجہ ہے۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا، لوگوں کو یہ مت بتانا کہ تمہیں گریجویشن میں سپلی آئی تھی۔ یہ دنیا صرف نتائج کو دیکھتی ہے، محنت کو نہیں۔ تمہاری قابلیت تمہارے جہاز اڑانے کی مہارت ہے، نہ کہ تمہاری تعلیمی ڈگری۔''

اسما پہلے تو حیران ہوئی، لیکن پھر اس نے سوچا کہ ماں صحیح کہہ رہی ہیں۔ دنیا ہمیشہ لوگوں کی کامیابی کے پیچھے چھپی جدوجہد کو نہیں سمجھتی۔ اس نے اپنی ماں کی بات مان لی اور اپنی زندگی

میں آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا۔

اب اسما ایک بہترین پائلٹ تھی، جو اپنی مہارت سے مسافروں کو منزل تک پہنچاتی۔ اگرچہ وہ اپنی تعلیمی ناکامی کا ذکر نہیں کرتی، لیکن اس کی پرواز، اعتماد اور مہارت ہی اس کی اصل پہچان بن گئی۔ ایک دن، ایک شاگرد نے اسما سے پوچھا۔

''میڈم، آپ کی کامیابی کا راز کیا ہے؟''

اسما مسکرائی اور بولی۔

''کامیابی صرف ڈگری سے نہیں، بلکہ محنت، جنون، اور اپنے خوابوں کو حقیقت میں بدلنے کی لگن سے ملتی ہے۔ میں نے اپنی ناکامیوں کو کبھی اپنے خواب پر حاوی نہیں ہونے دیا۔''

❖❖❖❖❖

انسانیت کا پیکر

کچھ لوگ زمین پر ستاروں کی مانند ہوتے ہیں۔ مدھم مدھم روشنی دیتے ہیں، اور اگرچہ ان کی روشنی سے راستے مکمل طور پر واضح نہ ہوں، مگر انہی کی روشنی سے منزل پر پہنچنے میں مدد ملتی ہے۔ ایسے لوگوں کے دل شیشے کی طرح صاف اور نیت پانی کی طرح شفاف ہوتی ہے۔ وہ اپنے سے جڑے رشتوں کے لیے فخر اور انسانیت کے لیے مشعلِ راہ بن جاتے ہیں۔ ان کے کردار کو اپنانے کو دل بے اختیار مائل ہوتا ہے اور ان کے راستے پر قدم رکھنے کی خواہش جاگتی ہے۔

ڈاکٹر ایمن کا کردار بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ دراز قد، سفید رنگت اور شاندار شخصیت کی حامل، جنہیں دیکھتے رہنے کو دل چاہے۔ اللہ نے ڈاکٹر ایمن کو حُسن کی دولت کے ساتھ مال و دولت سے بھی نوازا تھا۔ تین بچوں کی ماں ہونے کے باوجود لوگ انہیں ماں ماننے کو تیار نہ ہوتے بلکہ اکثر انہیں کالج گرل سمجھتے۔ وہ اپنی صحت کا بے حد خیال رکھتی تھیں۔ ڈاکٹر ایمن کے ہاتھ میں شفا کے ساتھ حسنِ سلوک کا ہنر بھی تھا، یہی وجہ تھی کہ سرکاری ہسپتال میں کئی ماہر ڈاکٹروں کی موجودگی کے باوجود لوگ ان کے پرائیویٹ ہسپتال کا رخ کرتے۔ وہ اپنے مریضوں کے لیے بہترین مسیحا تھیں۔

ڈاکٹر ایمن کا ایمان تھا کہ مریضوں کو بے جا تنگ کرنا یا ان سے غیر ضروری پیسے لینا کسی صورت انسانیت نہیں۔ وہ مریضوں کے ساتھ ایسے رویے کی سخت مخالف تھیں۔ ان کے حسنِ اخلاق کی وجہ سے خواتین ان کی شیدائی تھیں اور ان کا ذکر اکثر زبان زدِ عام رہتا۔

میرا اشتیاق بڑھ چکا تھا کہ میں اس شخصیت سے خود ملوں، جس نے پورے علاقے کو دیوانہ بنا رکھا تھا۔ ایک دن میں اپنی کزن شیما کے ساتھ ان سے ملاقات کے ارادے سے روانہ ہوئی۔ ہمارا گاؤں شہر سے ایک گھنٹے کی مسافت پر تھا، سو ہم صبح ہی نکل پڑے۔ وقت ضائع

ہونے کے خوف سے جلدی جلدی تیار ہو کر چائے حلق سے اتار دی اور ہائی ایس میں بیٹھ گئیں۔

ہسپتال پہنچے تو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر ایمن ابھی تک نہیں آئی تھیں۔ ہر طرف خواتین بنچوں پر بیٹھی تھیں اور ہم بھی ایک کونے میں جا بیٹھے۔ میں نے شیما سے مذاق کرتے ہوئے کہا، ''اب نو بجنے والے ہیں، تمہاری لاڈلی ابھی تک نہیں آئی۔''

شیما نے گھور کر کہا، ''چپ رہو، شمع!'' میں خاموش ہوگئی، مگر دل میں بے قراری تھی۔

اتنے میں ڈاکٹر ایمن ہسپتال میں داخل ہوئیں۔ ان کی شخصیت واقعی دلکش تھی۔ میں نے شیما سے کہا، ''واقعی، یہ تو بہت خوبصورت اور متاثر کن ہیں۔'' شیما مسکرا دی۔ ڈاکٹر ایمن نے مریض دیکھنے شروع کیے اور ہم نے انتظار کیا کہ جب رش کم ہو تو ان سے ملاقات کریں۔

جب مریض کم ہو گئے تو میں اور شیما اندر گئے۔ ڈاکٹر ایمن نے نہایت نرمی سے شیما کا چیک اپ کیا اور ہر بات تفصیل سے سمجھائی۔ میں نے کہا، ''میم، آج میں بہت دور سے آپ کو دیکھنے آئی ہوں۔ آپ کے مریضوں نے آپ کی اتنی تعریف کی کہ مجھے بے حد اشتیاق ہوا۔''

ڈاکٹر ایمن مسکرائیں اور بولیں، ''یہ سب اللہ کا کرم ہے۔ میں تو صرف اپنی ذمہ داری نبھاتی ہوں۔''

میں نے ان سے پوچھا، ''آپ اتنا کام کیسے کر لیتی ہیں؟''

ڈاکٹر ایمن نے نرمی سے جواب دیا، ''یہ سب اللہ کا دِیا ہوا ہنر ہے۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ ہر مریض کو انسان سمجھوں چاہے وہ غریب ہو یا امیر۔ میرے نزدیک سب برابر ہیں۔ یہ میرا ایمان ہے کہ انسانیت کا احترام کیے بغیر اللہ کی رضا ممکن نہیں۔''

ڈاکٹر ایمن کا ہسپتال پرائیویٹ تھا اور وہ اکثر اوور ٹائم کرتیں تاکہ زیادہ سے زیادہ مریضوں کی خدمت کر سکیں۔ ان کے اس اضافی کام کی آمدنی میں وہ اپنے اسسٹنٹ کو بھی برابر کا حصہ دیتی تھیں۔ ان کا ماننا تھا کہ انصاف ہر رشتے اور تعلق میں ضروری ہے اور یہی سوچ انہیں اپنے عملے کے ساتھ بھی اپنانے کی ترغیب دیتی تھی۔ یوں مہینے کے آخر میں ان کے

اسسٹنٹ کی تنخواہ دوگنی ہوجاتی تھی۔ یہ ان کا اپنے اللہ کو راضی کرنے اور انصاف کا تقاضا تھا۔

ڈاکٹر ایمن نے کہا کہ میں اپنے گھر کے ملازمین کے ساتھ بھی حسن سلوک کا رویہ رکھتی ہوں اور بچوں اور بہوؤں کو بھی ہدایت دیتی ہوں کہ ملازمین کو کبھی یہ احساس نہ ہونے دیں کہ وہ نوکر ہیں۔ دیکھا جائے تو ہر شخص اپنی جگہ نوکری کر رہا ہے، کوئی اعلیٰ درجے کا تو کوئی ادنیٰ درجے کا نوکر ہی ہے مگر بطور انسان سب برابر ہیں۔

میں ان کی باتیں سن کر بے حد متاثر ہوئی۔ میں نے کہا، ''اتنی عزت اور احترام یقیناً آپ کے اخلاق اور حسنِ نیت کا ہی نتیجہ ہے۔ کہتے ہیں کہ اللہ کسی کا احسان اپنے پاس نہیں رکھتا، وہ بندوں سے کی ہوئی نیکی بندوں کے ذریعے ہی لوٹا دیتا ہے۔ سبحان اللہ''

جب ہم واپس لوٹے تو دل مطمئن تھا کہ واقعی ڈاکٹر ایمن جیسی ہستی کے لیے تعریف کے الفاظ کم ہیں۔ ان کا کردار اور انسانیت کا جذبہ آج کے دَور میں مشعلِ راہ ہے۔

❖❖❖❖❖

سجدہ

ثانیہ سجدے میں پڑی ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ اپنے رب سے کردہ اور ناکردہ گناہوں پر معافی مانگ رہی تھی۔ زندگیمیں اس قدر دکھ اٹھا چکی تھی کہ مزید سہنے کی متحمل نہ تھی۔ آج صبر کا بند ٹوٹ گیا تھا۔ وہ اپنے رب کے سامنے خود کو اس انسان کی مانند ڈال چکی تھی، جو دریا برد ہونے کے بعد ہاتھ پاؤں چھوڑ دیتے ہیں اللہ! اب تو طاقت بھی نہیں رہی۔ یہ جملہ بار بار اس کے لبوں سے نکل رہا تھا۔

زندگی پہلے ہی مسائل سے بھری ہوئی تھی اور اب ایک جاب تھی، وہ بھی ختم ہوگئی تھی۔ یہ جاب اس کے لیے صرف روزگار کا ذریعہ نہیں، بلکہ امید کی آخری کرن تھی۔ نوکری جانے کے بعد زندگی جیسے رک سی گئی تھی۔ روز بروز بڑھتے مسائل اور مایوسی نے اس کی روح تک کو تھکا دیا تھا۔ لیکن آج تو جیسے دل کی دیواریں بھی ٹوٹ پھوٹ گئیں۔

وہ ہمیشہ سوچتی رہی کہ اللہ کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں، مگر آج اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ وہ اپنے رب کے حضور اپنی تکلیفیں اور خواب رکھ کر اس کی دہلیز پر ہوش کھو بیٹھی تھی۔

کئی گھنٹے گزر گئے۔ تبھی کسی نے اس کے شانے پر نرمی سے ہاتھ رکھا۔ وہ بمشکل ہوش میں آئی۔ سامنے اس کی ماں کھڑی تھی، پانی کا گلاس لیے۔ ماں نے گلاس لبوں سے لگایا اور نرمی سے کہا، "بیٹی، خود کو تکلیف مت دو۔ اللہ سب پر مہربان ہے۔ تم پر بھی کرم کرے گا۔

ثانیہ نے آنسو بھری آنکھوں سے ماں کو دیکھا اور کہا، ''اماں، بے صبرہ نہیں ہوں، لیکن اب سہنے کی طاقت نہیں رہی۔'' شام کو موبائل کی گھنٹی بجی۔ یہ آواز جیسے کسی خوشخبری کا اعلان کر رہی تھی۔ ''ثانیہ، آپ کو دوبارہ نوکری پر رکھ لیا گیا ہے۔ کل سے آپ آفس جوائن کریں۔''

موبائل ہاتھ میں تھامے اس کی آنکھوں سے شکرانے کے آنسو بہنے لگے۔ ''یا رب، جب تجھے دل سے پکاروں، تو تُو سنتا ہے۔ تیرے خزانوں میں کمی نہیں۔ محرومی تو ہماری دُعاؤں میں ہوتی ہے۔

❖❖❖❖❖

دل صحرا

واہ خوش آمدید،نسیمہ آئی ہے آیئے آیئے، کیسے آنا ہوا،آج آپ ہمارے غریب خانے پر، زہے نصیب، میری بہت دیرینہ دوست، رازداں سہیلی پتہ نہیں کتنے مہینوں بعد مل رہی تھی۔۔۔
میں اپنی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ہم دونوں ایک دوسرے سے بغل گیر ہوگئ، کافی دیر کے بعد میں نے ہاتھ پکڑ کرنسیمہ کو ساتھ بٹھایا اور حال احوال پوچھا اور خاطر تواضع کے ساتھ ساتھ باتوں کا سلسلہ چل نکلا،خواتین پر ویسے بھی الزام ہے جہاں دوخواتین ملیں ان کی باتیں ختم نہیں ہوتیں، یہاں پر دو بچھڑی ہوئیں سہیلیاں مل گئی تھیں۔۔۔
خیر باتیں جاری تھیں لیکن نسیمہ نے آہستہ سے کہا جمیلہ تم نے کچھ سنا؟اس کی آواز میں کچھ تھا۔میرا دل بے اختیار دھڑ کا،نہیں سنا،کیا ہوا ہے؟غلام علی جو ہے اِن کی بیٹی نے خودکشی کی ہے۔کیا؟ کب؟ کیوں؟ میں نے حیران ہو کے کئی سوال کر ڈالے،تم پُرسکون رہو،پُرسکون؟ لگتا ہے شاید شادی کا چکر ہے۔وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے۔لیکن ماں باپ نے اس کی شادی اپنی مرضی سے کرنا چاہتے تھے۔۔۔اچھا آج کل خودکشی کچھ زیادہ نہیں ہونے لگی ہے؟
نسیمہ یہ ماں باپ ہر خواہش پوری کر کے ایک اس خواہش کو رد کیوں کرتے ہیں؟جس پر پوری زندگی انحصار کرنا پڑھتا ہے۔مجھے بہت افسوس ہوا،ہاں ردا سب کو بہت دکھ ہو رہا ہے۔
کچھ دیر رک کے نسیمہ چلی گئی لیکن میں رات بھر سو نہیں سکی۔دل کے درد نے کچھ ایسی کروٹ بدلی، جیسے تپتے، صحرا بن گئے ہوں، حال میری نظروں سے اوجھل ہوگیا اور آنکھوں میں ماضی جیسے رقص کرنے لگا۔جب میں بھی تحمینہ کی عمر کی تھی اور مجھے اپنے محلے کے ایک لڑکے سے محبت ہوگئی تھی۔میں 4 بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی ماں باپ کی لاڈلی بیٹی،سب مجھے پھولوں کی طرح رکھتے تھے۔
گھر والے جب اتنی عزت،محبت دیتے ہیں تو عزیز رشتہ دار سے بھی محبت اور خلوص ملتا

ہے۔سو میں محبتوں کو سمیٹتے تعلیمی سڑھیاں طے کرنے لگی۔دیہاتی ماحول اور لڑکیوں کو زیادہ تعلیم نہ دینے کا رواج ہوتے ہوئے بھی میرے والدین نے مجھے اجازت دی تھی کہ میں جتنا پڑھنا چاہوں پڑھ سکتی ہوں اور تعلیم میرا شوق بھی تھا ذوق بھی، میں کالج سے یونیورسٹی جانے لگی۔ میری احمر کے ساتھ کبھی کبھی بات چیت بھی ہوتی رہتی، کیونکہ میں نے اس سے کہہ رکھا تھا۔میں آپ سے محبت، بلکہ عشق کرتی ہوں، پر اس کا مطلب یہ نہیں میں ہر گھنٹے بعد یا رات بھر آپ سے بات کرتی رہوں گی،ایسا نہیں ہوگا۔۔۔

آپ بھی پڑھائی پر توجہ دیں، میں بھی یکسوئی سے پڑھوں گی، پھر ان شاء اللہ ہمیں ایک ہونے سے کوئی نہیں روک سکے گا۔احمر نے مسکراتے ہوئے کہا ان شاء اللہ، کبھی کبھار ہم بات بھی کر لیتے،اس میں مستقبل کے حسین خواب ہُوا کرتے،ایک خوبصورت سے گھر ان میں بچوں کی قلقاریاں بھی ہوتیں، یوں ایک حسین خواب لے کر میں اور احمر زندگی کے شاہراہِ خرماں پر چلتے جا رہے تھے۔اس بات سے بے خبر تقدیر کا کیا پلان ہے؟اور محبت کرنے والے ماں، باپ،آرزو، پورا کرنے والے بھائی،کسی دن سب خواہش پورا کرتے کرتے اچانک آتیں جاتیں سانسیں بن کر دیں گے۔

کتنا تکلیف دہ عمل ہوتا ہے جب آپ سے کوئی کہہ دے، کہ آج سے تمہاری سانسوں کی آمدرفت پہ پابندی لگا دی گئی ہے تمہارے رگوں میں چلتے خون پر بند بندھ دیا گیا ہے۔۔۔

احمر کے گھر والے تعلیم مکمل ہونے کے بعد رشتہ کے لیے آئے تو میں بہت خوش تھی۔پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔پھر اچانک امی سامنے آ گئی۔۔۔

میں نے مسکرا کے امی کو دیکھا،لیکن امی کی تاثرات کچھ اچھے نہیں تھے۔کیا ہوا امی؟ کچھ نہیں بس تمہارے ابو نے احمر کے گھر والوں کو منع کیا ہے۔پتہ نہیں مجھے چکر پہلے آئے تھے۔یا امی نے سوال پہلے کیا تھا۔۔۔

امی نے گرنے سے پہلے مجھے تھام لیا تھا۔کچھ دیر بعد آنکھ کھول کے امی کو دیکھا،ساتھ میری آنکھوں سے آنسو برسات کی صورت بہہ رہے تھے۔۔۔امی مجھے سمجھانے لگیں۔میری بیٹی ایسا

کیوں کررہی ہو؟ تم کو نہیں بتایا ہے۔ تمہاری بات بہت پہلے سے تمہاری تایا کے بیٹے کے ساتھ طے ہے۔۔۔

آپ لوگوں نے یہ ظلم مجھے پر کیوں کیا امی؟ مجھے پہلے سے معلوم ہوتا تو میں اتنا آگے نہ جاتی، بلکہ ایسا کچھ سوچتی بھی نہیں، آپ سب نے میرے ساتھ دشمنی کی ہے۔ میری دل کا میری جذبات کا قتل کیا ہے۔۔۔

میں رورو کے فریاد کررہی تھی۔ لیکن کسی پر کوئی اثر نہیں ہوا، احمر کال کر کے مجھے سے اپنا قصور پوچھ رہا تھا۔ لیکن میں کچھ کہنے کی قابل بھی نہیں تھی دکھ سے میرا برا حال تھا۔ اس وقت نہ مجھے والدین کی عزت کا خیال آرہا تھا۔ نہ بھائیوں کا، میرا دل کر رہا تھا۔ میں جا کے دریا میں کود جاؤں، یا کسی بھی طرح خودکشی کرلوں، جو مجھے اس درد سے نجات دلادے، مجھے لگ رہا تھا۔ کہ میری سانسیں رک رک کے آرہی ہیں۔ سانس لینے میں بھی تکلف ہورہی تھی لیکن گھر والے سب جانتے ہوئے بھی انجان بن کے میری شادی کی تیاری کرنے لگے۔ کچھ دن بعد ہی میں دلہن بن کر جمال کی زندگی میں آگئی لیکن میرا ذہن، سوچ، کچھ بھی میرا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔

میں نے احمر سے عشق کیا تھا اور میرے گھر والوں نے اس کے ٹکڑے کیے۔ آج کئی سال گزرنے کے بعد بھی جب بھی سوچتی ہوں، مجھے پہلے دن جیسی تکلیف ہوتی ہے۔۔۔ کسی بھی ماں باپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے۔

آج نسیمہ نے یہ بتایا تو مجھے لگا کہ یہ سب ابھی اور آج ہی مجھ پر گزری ہے رات کٹ گئی تھی اور صبح کی آذان ہورہی تھی۔ میں نے آنکھوں کو رگڑ کر صاف کیا۔۔۔ اور نماز کے لیے اٹھ گئی درد جتنا بھی شدید کیوں نہ ہو، زندگی تو گزارنی ہی پڑتی ہے زندہ لاشوں کی طرح جینا تو پڑھتا ہے کبھی خود کے لیے کبھی اپنے ساتھ بندھے رشتوں کے لیے۔۔۔

❖❖❖❖❖

مطالعہ

شوق کسی بھی چیز کی ہو اس پر جس طرح چاہے بند باندھا جائے وہ اپنا راستہ خود تلاش کر کے اپنی شوق کی تسکین کا سامان کر لیتے ہیں۔۔۔

ایسے ہی ایک شوق وجنون کی کہانی صفحہ قرطاس پر منتقل کرنا چاہتی ہوں، ایسے لوگوں کے لیے جو کسی بھی چیز کا شوق رکھتے ہیں لیکن نامسند حالات دیکھ کر مایوس ہو جاتا ہے۔۔۔

یہ ایک سبق آموز ہے کہ حالات جیسے بھی ہو جائے کبھی بھی ہمت نہیں ہارنا چاہیے ہے، ہمارا تعلق ایک پسماندہ گاؤں سے ہے، جہاں تعلیم کوئی اہمیت نہیں رکھتا، زمینداری کے ساتھ مال مویشیوں کی کاروبار اور مزدوری کرنا یہاں کا شیوہ ہے۔۔۔

ایسے ماحول میں پتہ نہیں میرے ابو نے تعلیم کا شوق کہاں سے چرایا تھا۔ابو پر تعلیم حاصل کرنے کا جنون سوار تھا۔چھوٹے سے عمر میں وہ تعلیم کی غرض سے شہر چلا آیا، یہاں ایک مسافر خانے میں رہائش اختیار کیا۔۔۔

ماں باپ نے بہت روکا لیکن وہ روکنے والا نہیں تھا۔اس لیے انہوں نے بھی ہار مان کر ان کی خرچا پانی کا بندوست کر دیا یا، یوں ابو اس وقت کے اوّل کلاس اور آج کی (نرسری میں) ایڈمیشن لے لیا، ابو بہت خوش تھے۔اور دل لگا کر پڑھنا شروع کیا تھا۔۔۔

اول نمبر میں پاس ہوتے جب ابو نے چوتھی جماعت پاس کیا تو مولانا لوگ نے فتویٰ دیا کہ انگریزی تعلیم حاصل کرنا حرام ہے۔اس پر ابو کی تعلیم چھوٹ گیا۔۔۔

لیکن ابو ہر صبح سکول کے سامنے جا کے روتے رہتے تھے۔ایک دن ان کی والد گاؤں سے آ کے ابو کو واپس لے گیا۔ابو نے اپنے شوق کو مرنے نہیں دیا، جہاں کہیں کچھ لکھا ہوا ملتا، وہ اس کو اٹھا کے پڑھتا اور اپنی شوق کی تسکین کرتا یوں اپنے شوق کے ساتھ بڑا ہوتا گیا۔انہوں نے بہت محنت کرنا شروع کیا۔ساتھ میں اپنی پیسے سے کتابیں بھی خریدنے لگا اور اسے دل لگا کے

پڑھتے ،ابو کی محنت رنگ لائے اور اللہ کے فضل سے ابو کے پاس عزت دولت شہرت نیک بیوی اور بچے بھی تھے۔ابو اپنی نیک خصلت کی وجہ سے رحم دل مشہور تھے۔۔۔

سب لوگ ابو کی عزت کرتے ،ابو بھی غریب غرباءسب کا خیال رکھتے تھے۔ساتھ میں اپنی شوق کی تکمیل کے لیے ایک کمرہ لائبریری بنا دیا اور اس میں 500 سے زائد کتابیں ہیں وہ سب ابو کے زیرِ مطالعہ رہتے تھے،جب کسی سے ملتا یا بات چیت ہوتی تو لوگ پوچھتے ،آپ نے کس ویونیورسٹی سے پڑھا ہے۔۔۔

ابو اپنی کھیت کا نام بتاتے ،میں نے اس یونیورسٹی سے پڑھا ہے اور لوگ یقین نہیں کرتے ،ان کی شوق نے انہیں اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں سے زیادہ باشعور بنا دیا تھا۔وہ خواتین کی احترام کرتے بچوں سے پیار کرتے غریبوں کی مدد کرتے لوگوں میں صلح کراتے بہت انسانیت دوست انسان تھا۔۔۔

جس نے کسی سکول یونیورسٹی کا منہ نہیں دیکھا تھا لیکن 500 کتابیں وہ پڑھ چکے تھے۔اپنی تشنہ شوق کی تکمیل نے ہم پر پورا کیا۔۔۔

ہم سب بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوایا، معاشرے میں ایک مقام دیا،آسائش بھری زندگی دی،ان کی ہی کوشش اور دُعاؤں کا نتیجہ ہے آج میں ایک باعزت پیشے سے منسلک ہوں ،ڈاکٹر ردا فاطمیہ جو کچھ بھی ہے والدین کی محنت اور دُعاؤں کی مرہونِ منت ہے۔

❖ ❖ ❖ ❖ ❖

السمیع

اللہ تعالیٰ کے ننانوے اسمائے حسنیٰ میں سے ایک نام ''السمیع'' ہے۔ہم انسان ان اسماء کا مکمل احاطہ کرنے سے قاصر ہیں کیونکہ ہم خاک سے بنے، اپنی ہر ضرورت کے لیے اللہ رب العزت کے محتاج ہیں۔ یہاں تک کہ دُعا مانگنے کے لیے بھی ہمیں اللہ کی مدد درکار رہوتی ہے، کیونکہ جب تک وہ پاک ذات چاہے نہ، ہماری زبان ہل سکتی ہے نہ دل میں مانگنے کی توفیق پیدا ہوتی ہے۔، اللہ کتنا فیاض اور مہربان ہے! وہ فرماتا ہے، ''السمیع، میں سنتا ہوں۔'' وہ صرف زبان سے ادا کیے گئے الفاظ کو ہی نہیں بلکہ دل کے پوشیدہ رازوں کو بھی جانتا ہے۔اللہ نے کبھی یہ نہیں فرمایا کہ وہ صرف نیکوکاروں، بزرگوں، یا صدقہ دینے والوں کی بات سنتا ہے۔ بلکہ اس کا فرمان ہے، ''السمیع، میں سب کی بات سنتا ہوں۔'' یہ اعلان اس کی رحمت اور فیاضی کا سب سے بڑا اظہار ہے کہ وہ بغیر کسی تخصیص کے ہر ایک کی فریاد سنتا ہے۔

جب یہ یقین ہو جائے کہ اللہ سب سے بہتر رازداں اور سب سے بہترین سننے والا ہے، تو پھر ہمیں خود کو اذیت دینے یا انسانوں کے آگے اپنی فریاد رکھنے کی ضرورت کیوں محسوس ہو؟ اپنی امیدوں اور دُعاؤں کو اللہ کے در پر چھوڑ دینا چاہیے۔اپنے ضبط کے بندھنوں کو اللہ کے حضور توڑ دینا چاہیے اور پوری دل جمعی سے کہنا چاہیے، ''السمیع، السمیع۔''

جب اللہ سنتا ہے، تو وہ سکون کا مرہم بھی بن جاتا ہے۔وہ دل کو اطمینان، روح کو سرور، اور زندگی کو خوشیوں سے مالامال کر دیتا ہے۔یہ سکون اور اطمینان اللہ کی نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت ہے۔جب اللہ کی نظر کرم ہو جائے، تو پھر کسی بھی پریشانی کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

دل کا مطمئن ہونا دُعا کی قبولیت کی علامت ہے۔اللہ ''السمیع'' ہے، وہ سنتا بھی ہے اور وقت آنے پر ہماری ہر پکار کو قبول بھی کرتا ہے۔اسی لیے ہمیں کبھی مایوسی کو اپنے دل میں جگہ نہیں دینی چاہیے۔اللہ کا یہ اسم ہمیں یقین دلاتا ہے کہ وہ اللہ ہماری زندگی کے ہر لمحے میں ہمارے ساتھ ہے، سننے والا اور مددگار۔

❖❖❖❖❖